مجموعۂ کلام محروم

معروف بہ

گنج معانی

جناب منشی تلوک چند صاحب محروم بی۔ اے

کی

اخلاقی۔ ادبی اور نیچرل نظمیں

سنہ ۱۹۳۲ء

میسرز عطر چند کپور اینڈ سنز پبلشرز انارکلی لاہور

نے

اپنے مطبع کپور آرٹ پرنٹنگ ورکس لاہور میں باہتمام لالہ گوراندتا کپور مینجر چھپوایا۔

بار اول

فہرستِ مضامین

دیباچہ

از

آنریبل خان بہادر سر شیخ عبدالقادر۔ بی۔ اے

بیرسٹرایٹ لاء۔ جج ہائی کورٹ پنجاب

میرے قدیم کرم فرما جناب تلوک چند صاحب محروم اپنے تخلص کی مناسبت سے دنیا کی بعض اور نعمتوں سے محروم رہے ہوں۔ تو اور بات ہے۔ مگر خداداد لطف سخن اور موزونیء طبع سے انہیں حصہء وافر ملا ہے۔ اور ان کا کلام خلعت قبول عام سے محروم نہیں رہا۔ بڑے بڑے سخنوروں نے اُن کی شاعری کو سراہا ہے۔ اور ان کے حسن بیان کی تعریف کی ہے۔ شائقین ادب اُردو یہ سنکر خوش ہونگے۔ کہ کلام محروم جو اس وقت تک بیشتر ادبی رسائل کے اوراق

ہیں اور کچھ حصّہ مُصنّف کے مسودوں میں محفُوظ تھا۔ ایک دلچسپ مجمُوعے کی شکل میں شائع ہو رہا ہے۔ یہ مجمُوعہ میرے سامنے ہے۔ اور میں جناب مُصنّف کا شُکر گزار ہوں۔ کہ اُنھوں نے اشاعت سے پہلے اپنی کتاب کا ایک نُسخہ مجھے عنایت کیا۔ اُنکی خواہش ہے۔ کہ میں اِس کتاب کا مُختصر سا دیباچہ لکھوں +

یہ فرمائش اُن تعلّقات کی بنا پر کی گئی ہے۔ جو رسالہ مخزن کے دَورِ اوّل کے زمانہ سے میرے اور جناب محرومؔ کے درمیان قائم ہیں۔ آپ کی کئی نظمیں پہلے مخزن میں شائع ہو کر مقبُول ہُوئیں۔ الفاظ کی برجستگی۔ بندش کی چُستی۔ خیالات کی پاکیزگی حضرت محرومؔ کے اشعار کی خصُوصیات ہیں۔ مگر اُن کی شاعری کا جو وصف مجھے خاص طور پر پسند ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ اِس میں صُلح و محبّت کی تلقین ہے۔ دُنیا کے سب بڑے بڑے مذہبی پیشواؤں کی خوبیاں جناب محرومؔ کے پیشِ نظر ہیں۔ وہ چاہتے ہیں۔ کہ ہندوستان والے سب کو عزّت کی نِگاہ سے دیکھیں۔ اور اِن

کی بیش بہا زندگیوں سے سبق حاصل کریں ؎

ایک اور چیز جو اِن کے کلام میں زیادہ پائی جاتی ہے۔ وُہ کیفیتِ غم ہے۔ بہار ہو یا خزاں۔ قُدرت کے ہر منظر کو دیکھ کر اُن کے دِل کا کوئی نہ کوئی زخم تازہ ہو جاتا ہے۔ معلُوم ہوتا ہے قُدرت نے درد و گداز طبیعت میں حد سے زیادہ رکھّا تھا۔ اِس پر بعض ذاتی صدمات ایسے پیش آئے۔ کہ شاعر سراپا درد ہو گیا ؎ اِن صدموں میں سے سب سے زیادہ اثر اِس جاں کاہ زمانے کا ہے جب محرُوم کی جوان بیوی شادی کے چند سال بعد ایک ننّھی سی لڑکی چھوڑ کر اِس دُنیا سے چل بسی۔ اِس کو بسترِ مرگ پر دیکھ کر جو کچھ اُن کے دِل پر گزری۔ ننّھی سی بیٹی کی بے بسی سے جو رنج ہُوا۔ اپنی خانہ ویرانی کا جو مُسلسل نقشہ آنکھوں میں پھرا۔ یہ سب کیفیّتیں نہایت درد بھرے لفظوں میں بیان ہُوئی ہیں۔ اور اِس حصّے کا عُنوان "طوفانِ غم" ہے۔ اِن نظموں میں سے ایک میں سب دُنیاوی رشتوں کی ناپائیداری کا بیان کرتے

ہوئے، کوشش صبر کے باوجود اپنی مجبورانہ اشکباری کا ذکر ان شعروں
میں کیا گیا ہے ؎

کتنے ہی استوار ہوں، ٹوٹیں گے ایک دن
رشتے یہ جتنے الفت و مہر و وفا کے ہیں
محروم! یہ تو مجھ کو بھی معلوم ہے کہ ہم
جو کچھ ہیں چلتے پھرتے کھلونے قضا کے ہیں
کرتا ہوں میں تو صبر بھی اور دل پہ جبر بھی
اشکوں کو کیا کروں؟ کہ یہ خود سر بلا کے ہیں

یہ درد اور اپنے نقصان کا احساس یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔
بلکہ کانٹے کی طرح ہر جگہ دل میں چبھتا رہتا ہے۔ شاعر کنار راوی
پر بیٹھا ہے۔ قدرت اپنے دلچسپ نظّارے دکھلا رہی ہے مگر
مغموم آنکھ اپنے غم کے سبب ان نظّاروں کے حسن
کا لطف نہیں اٹھا سکتی ؎

چنانچہ یہ اشعار ملاحظہ ہوں :-

آنکھ کھولی ادھر ستاروں نے ۔۔۔ جلوے دکھلائے ماہ پاروں نے

گو اشارے کئے ہزاروں نے ۔۔۔ آنکھ اُٹھائی نہ غم کے ماروں نے

شامِ غم ہے، کنارِ راوی ہے

مَیں ہُوں اور میری سینہ کاوی ہے

"فصلِ بہار" پر نظم لکھی جارہی ہے بہار کی کیفیّت کا نقشہ نہایت خوبی سے کھینچ رہے ہیں۔ کہ یکایک اپنا غم یاد آجاتا ہے۔ اور نظم اِس بند پر ختم ہوتی ہے ؎

آمدِ گُل کا ہمکو کیا احساس؟ ۔۔۔ دِل ہے پہلُو میں کب سے کشتۂ یاس

یہ جو نالے ہیں زینتِ قرطاس ۔۔۔ ہے فقط اپنی شاعری کا پاس

ورنہ ہمکو خزاں بہار ہے ایک

برگِ گُل اور نوکِ خار ہے ایک

محرُوم کی درد بھری طبیعت دُوسروں کے درد کو بھی معمُول سے زیادہ محسُوس کرتی ہے۔ اُنھوں نے اپنے بعض ہمعصروں کے بے وقت اِنتقال پر آنسو بہائے ہیں۔ جن میں سچّی محبت اپنا

جلوہ دکھا رہی ہے۔ مولانا گرامی، طالب، بنارسی، سرور، جہان آبادی نادر کاکوری، چکبست لکھنوی وہ حضرات تھے جن کے اشعار کلامِ محروم کے ساتھ بارہا زیبِ اوراقِ مخزن ہوئے محروم کو ان سے غائبانہ اُنس تھا۔ مگر وائے محرومی! کہ وہ یکے بعد دیگرے چل بسے۔ گرامی اور طالب تو خیر عمرِ طبیعی کو پہنچ لئے تھے۔ گو اُن کے جانے سے شاعری کو نقصان پہنچا۔ مگر سرور، نادر اور چکبست جوانی میں اس جہان سے رخصت ہوئے۔ اُن کی شاعری ابھی شباب پر تھی۔ کہ وہ اپنے بیشمار مداحوں کو داغِ مفارقت دے گئے۔

جو مثالیں اُوپر درج ہوئیں۔ ان سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے۔ کہ شاعر صرف تصویرِ غم کھینچنے ہی میں اُستاد ہے۔ قوتِ سخن خوشی کے منظر دکھانے سے بھی قاصر نہیں۔ "ہلالِ عید" پر ایک دلکش نظم ہے تمہید کا چلبلا پن۔ اور اسلوبِ بیان قابلِ داد ہے۔

دیکھو دیکھو وہ مَیں نے دیکھ لیا۔ قُلّۂ کوہ سے ذرا اُونچا!
چُھپ گیا چُھپ گیا کہیں دیکھو۔ پھر نظر آئیگا وہیں دیکھو!
وُہ جو ہے سامنے شجر دیکھو۔ اُس سے اُوپر اُٹھا نظر دیکھو!

اے لو! اے لو! وہیں نظر آیا!
مژدہ اے شائقین! نظر آیا!

بندرا بن میں صُبح ہو رہی ہے۔ اِس کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے مناظرِ قُدرت سے شاعر کی دِلچسپی اور ان کی تصویر سہل مگر رنگین الفاظ میں کھینچنا قابلِ توجّہ ہے ؎

صبحِ خنداں عروسِ تازہ ... آئی مل کر شفق کا غازہ
آئی اور کس ادا سے آئی ... شانوں پر کاکلیں طِلائی
چہرہ اس کا وہ یعنی خورشید ... بے پردہ عدوِ حسرتِ دید
ہر چیز کو پرتوِ سحر سے ... قُدرت نے رنگا ہے رنگِ زر سے

جمنا ابھی خواب سے اُٹھی ہے
پیدا بشرے سے تازگی ہے

طبع زاد نظموں کے علاوہ مرحوم کی ہمہ گیر طبیعت نے چمنِ اُردو کی آرائش کے لئے ہر باغ سے پھول لئے ہیں۔ انگریزی میں شیکسپیر کے ڈراموں سے بعض دلچسپ اشعار ترجمے کے لئے انتخاب کئے ہیں۔ اور اُن کو اُردو کا لباس ایسی خوبی سے پہنایا ہے۔ کہ اِن میں سے کئی پہچانے نہیں جاتے۔ کہ اصل میں یہ انگریزی ترا ہیں۔ مثلاً شبنم کے متعلق دو شعر ملاحظہ ہوں +

وہی شبنم جو غنچے پر مثالِ گوہرِ غلطاں
نظر آتی تھی اِترائی ہوئی خود اپنی قسمت پر
برنگِ اشک چشمِ شاہدِ گل میں نمایاں ہے
کوئی ہوا شکر ریزاں جس طرح اپنی ندامت پر

چند صفحے "سیرِ گلستان" کے زیرِ عنوان ایسے ہیں۔ جن میں حضرت سعدی شیرازی کی گلستان سے پند آمیز اشعار کا سادہ ترجمہ آسان اُردو میں کر دیا ہے۔ مثلاً یہ شعر دیکھئے:۔

لوگوں کی ملاقات کو جانا تو نہیں عیب × اِتنا بھی نہ جاؤ کہ وہ کہدیں کہ نہ آؤ

ایک اور شعر سعدی کا ہے جو بے تکلف اُردو کے سانچے میں ڈھل گیا ہے ؎

پیچھے جو تجھ کو چھوڑ چلا وہ شخص ترا ہمراہ نہیں
مت اُس سے لگا تو دل اپنا جس شخص کو تیری چاہ نہیں

مرحوم نے چونکہ عمر بھر محکمۂ تعلیم میں بسر کی ہے اس لئے خود ان کے کلام میں بہت سے حصّے جوانوں اور بچوں کیلئے نصیحت آمیز ہیں۔ آج کل نقّادانِ فن کا میلان اس رائے کی طرف ہے کہ نصیحت آمیز شاعری اصلی معنوں میں شاعری نہیں ہوتی۔ اُن کے نزدیک شاعری جذبات کے طوفانِ بے پایاں کا نام ہے۔ یا تخیّل کی نزاکتوں اور معنی آفرینیوں کا۔ البتہ اگر کوئی اُستاد معمولی مضامین میں بھی اپنی کاریگری سے رنگ بھرے تو وہ پند آمیز کلام کا رتبہ بلند کر دیتا ہے۔ مرحوم جا بجا اس فن میں کامیاب ہوئے ہیں۔ گو کہیں کہیں نصیحت صرف منظوم نصیحت رہ گئی ہے۔ پند رنگین کا نمونہ دیکھنا ہو۔ تو ایک نظم دیکھئے جس

میں شراب کی مذمت کی گئی ہے۔ شراب کی تعریف میں تو بہت سی رنگین شاعری ہو چکی ہے۔ اب مذمتِ شراب میں محروم کی طبیعت کا رنگ دیکھئے ؎

فریبِ دہر نے تدبیرِ جانستانی کی
کہ شکل آگ نے کی اختیار پانی کی
بہشت و حور میں سمجھا حور ہے نہ یہ کوئی پری ہے شیشے میں
رہے خیال کہ آتش بھری ہے شیشے میں

ایک نظم "اُستاد" کے عنوان سے لکھی ہے۔ اِس کے دو شعر قابلِ ملاحظہ ہیں۔ ایک میں کس سچائی سے تعلیم کی صحیح تعریف بیان کی گئی ہے۔ دوسرے میں واقعاتِ حاضرہ پر دو مصرعوں کے ساتھ تبصرہ کیا گیا ہے ؎

نہاں ہیں فطرتِ انسان میں جوہرِ عالی
ہنر سے اپنے ہے کرتا انہیں عیاں اُستاد
دلوں کی ہوتی تھی تعلیم فیضِ دل سے کبھی
زباں ہی آج تو شاگرد ہے زبانِ اُستاد

میں نے چند نظموں کے نمونے پیش کئے ہیں۔ ان کی رنگا رنگی اصل مجموعہ میں نظر آئیگی جس میں ہر مذاق کے لئے دلچسپی کا سامان موجود ہے۔ مہاتما بدھ ایوانِ شاہی سے رخصت ہو رہے ہیں۔ یہ سین بہت خوبی سے نظم کیا گیا ہے۔ رامائن سے ایک سین لیا ہے۔ اور رام چندر جی کے بن باس کا نقشہ دکھایا ہے۔ رباعیات ہیں، قطعات ہیں۔ تصوّف اور معرفت کا رنگ بھی موجود ہے۔ اس کی دو مثالیں درج کرتا ہوں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کی نگاہ قدرت کے گوناگوں نظاروں سے کس طرح اپنے فطرتی وجدان کو بڑھاتی ہے ؎

ا چمن میں، دشت میں، وادی میں، کوہ و صحرا میں
گہر میں، اولے میں، شبنم میں، ابر و دریا میں
شرر میں، شعلے میں، آتش میں برقِ سینا میں
شمیمِ گل میں، نسیمِ مسرت افزا میں
یہ سارے جلوے ہیں کس کے ؟ خدا کے جلوے ہیں۔

۲- آبشاروں کا ترنّم ترے بہلانے کو
لالہ زاروں کا تبسّم ترے بہلانے کو
دن کو ہنگامۂ مردُم ترے بہلانے کو
رات کو محفلِ انجم ترے بہلانے کو
مجھ کو دی تابِ تکلّم ترے بہلانے کو
اب بھی شاداں نہ ہوا اے دل! تو خطا کس کی ہے ؟

اس تقریب کو ختم کرنے سے پہلے میں دو باتیں خاص طور پر بیان کرنا چاہتا ہوں۔ ایک یہ کہ جناب محرومؔ اُن ہندو ادیبوں میں سے ہیں جنھوں نے اپنی عمر بھر کی محنت سے یہ ثابت کیا ہے۔ کہ اُردو ہندوؤں اور مسلمانوں کا ایک بیش قیمت سرمایہ ہے۔ جس سے دونو کو فائدہ اُٹھانے کا حق ہے۔ اور جس کی خدمت دونو کے ذمے ہے۔ خدا کرے کہ آپ دیر تک اُردو کی خدمت کے لئے زندہ و سلامت رہیں۔ دُوسری بات قابلِ ذکر یہ ہے

کہ ہم اس امر پر فخر کر سکتے ہیں۔ کہ محروم کا زاد بوم سرزمین پنجاب ہے۔ ہیں نے جب تک انہیں دیکھا نہ تھا۔ اور خط و کتابت کے ذریعے انہیں جانتا تھا۔ تو اُن کے کلام سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ صوبجات متحدہ کے کسی حصے کے رہنے والے ہیں جب ملاقات ہوئی تو پتہ چلا۔ کہ پنجاب کے اُس گوشے کے رہنے والے ہیں۔ جہاں اُردو کا چرچا بہت کم ہے۔ ضلع میانوالی آپ کا مسکن ہے۔ اُس جنگل میں خدا نے وہ خودرو پھول پیدا کیا۔ جس کی خوشبو دہلی اور لکھنؤ تک پھیلی۔ جناب محروم کے کلام کے متعلق حضرت اکبر الہ آبادی مرحوم نے یہ رباعی لکھ کر انکی طباعی کی تعریف کی تھی:۔

ہے داد کا مستحق کلام محروم　　لفظوں کا جمال اور معانی کا ہجوم
ہے اُن کا سخن مفید و دانش آموز　　اُنکی نظموں کی ہے بجا ملک میں دھوم

محروم نے اس داد کا شکریہ ایک رباعی میں ادا کیا ہے وہ لکھتے ہیں:۔

طبعِ موزوں خدائے برتر سے ملی تاثیرِ کلام قلبِ مضطر سے ملی
آیا مجھ کو یقیں کہ شاعر ہوں میں! جب دادِ سخن جنابِ اکبر سے ملی

میں نے شملے کے مُشاعرے میں اور اِس کے بعد لاہور کے بعض مُشاعروں میں جنابِ محرُوم کو پڑھتے سُنا ہے۔ اُن کا لہجہ سرحدی عِلاقے کا لہجہ ہے — گو اِن کا پڑھنا ایک خاص انداز رکھتا ہے — مگر اِسے سُنکر ان کی صفائیِ زبان پر اور بھی تعجّب ہوتا ہے۔ اور اِن کی کوشش اور کاوش کی داد دینی پڑتی ہے +

(سر) عبدالقادر

حمد و معرفت

ہر ذرّہ میں ہے ظہور تیرا — ہے برق و شرر میں نور تیرا

افسانہ ترا جہاں تہاں ہے — چرچا ہے قریب و دور تیرا

ہر ذرۂ خاک میں ہے لمعاں — مخصوص نہیں ہے طور تیرا

محتاجِ شراب و جام کب ہے — جس دل کو ہوا سرور تیرا

گاتے ہیں سحر ہوا ہیں کیا کیا — دم بھرتے ہیں سب طیور تیرا

تو جلوہ فگن کہاں نہیں ہے

وہ جا نہیں، تو جہاں نہیں ہے!

تاروں میں چمک دمک تری ہے — جو رعد میں ہے کڑک، تری ہے

اے باعثِ رونقِ گلستاں — شاخوں میں لہک لچک تری ہے

ہر غُنچے میں ہے ترا تبسّم — ہر گل میں بھری مہک تری ہے

نغمے مُرغانِ خوش گُلو کے — کہتے ہیں یہ سب چہک تری ہے

کہتی ہے کلی کلی زباں سے — میری یہ نہیں چٹک، تری ہے

شگفتہ ہے تو چمن چمن میں

خنداں ہے گلاب و یاسمن میں

خُوبوں میں ہے تیرا حُسنِ رعنا — ہر ایک حسیں ادا کا پُتلا

نوکِ مژہ میں تری خلش ہے — عُشّاق کے دل میں ہے جو کانٹا

تیکھی چتون، کٹیلی آنکھیں — گر اِن میں نہ ہو تُو کارفرما

ہیں صورتِ تیغ زنگ آلود — جس کا نہ اثر ہو دل پہ اصلا

اُس چہرے میں سادگی ہے تیری — چہرہ جو کوئی ہے بھولا بھالا

یکتائے زمانہ حُسن تیرا

عالم میں فسانہ حُسن تیرا

اے معنیٔ نازِ نازنیناں — دے نورِ جبینِ مہ جبیناں

عالم ہے نگار خانہ تجھ سے — اے مایۂ خوبیٔ حسیناں

تیرے ہی یہ ولولے ہیں دل میں — اے ذوقِ دلِ جمال بیناں

ہیں صبر و قرار تجھ سے قائم — اے مرہمِ زخمِ غم قریناں

او وجہِ تسلیٔ دلِ زار — او موجبِ راحتِ حزیناں

پروانے کو تیری ہی لگن ہے

اور شمع میں تیری ہی جلن ہے!

ناقوس میں تُو، اذاں میں تُو ہے — ہر شور میں، ہر فغاں میں تُو ہے

گنگا میں ہیں اُٹھتی تیری موجیں — زمزم کی صفائے جاں میں تُو ہے

ہر قافلہ میں تری صدا ہے — ہر منزل و ہر نشاں میں تُو ہے

ہے تیرے بغیر کون موجود　　　ہے کوئی اگر جہاں میں، تُو ہے

ہے دَیر و حرم میں تیرا جلوہ　　　القصّہ مکاں مکاں میں تُو ہے

سجدہ ہے ترا ہر اک کا مقصود

خالق تُو ہے سب کا اور معبود!

یہ کشمکشِ حیات کیا ہے　　　تیرا ہو کرم تو بات کیا ہے

اے رہبرِ کاروانِ ہستی　　　راہِ غمِ مشکلات کیا ہے

تُو جس کو دکھا دے اک تجلّی　　　کیا جانے وہ غم کی رات کیا ہے

جو مل گئے تجھ میں، اُن کے آگے　　　تمیزِ صفات و ذات کیا ہے

جس نے تجھ میں سمائی پالی　　　پھر اُس کو غمِ ممات کیا ہے

ہر ذرّے میں تیری جستجو ہے

محرومؔ کو بھی اک آرزو ہے!

ترانۂ وحدت

ہے نظارہ محوِ حیرت، کہ جہاں میں تُو ہی تُو ہے
کہیں آب ہے گہر میں، کہیں گُل میں رنگ و بُو ہے

مہ و مہر میں درخشاں، تو نجوم میں ہے تاباں
ترا نُور ہر طرف ہے، ترا جلوہ چار سُو ہے

دلِ سنگ میں شرر تُو، تو فلک پہ ہے قمر تُو
ہے زمیں پہ جلوہ گر تو سرِ آسماں بھی تُو ہے

تُو ہی بحر میں رواں ہے، تُو نسیم میں وزاں ہے
تُو یہاں نہیں وہاں ہے، یہ فضول گفتگُو ہے

ترے شوق میں بہائے ہیں چمن نے اشکِ شبنم
تو اسی سے اس کی رونق ہے، اسی سے آبرُو ہے

ترے عشق میں ہؤا ہے گُل تر جو چاک داماں
تو اسی لئے چمن میں وہ بہت شگفتہ رُو ہے
وہ کرشمہ اب دکھا دے کہ رہے مری زباں پر
"مجھے تیری آرزو ہے"! "مجھے تیری آرزو ہے"!

تُوہی تُو ہے

(تضمین)

نہ آنکھوں میں بیتابیٔ جستجو ہے — نہ دل میں وہ ہنگامۂ آرزو ہے
نہ وحشت نہ وہ شورشِ ہاؤہُو ہے — نہ لب پر غمِ ہجر کی گفتگو ہے
جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تُو ہی تُو ہے!

طیورِ سحر کی نواخوانیوں میں — مہ و مہر کی جلوہ سامانیوں میں
ہواؤں میں خشکی میں اور پانیوں میں — فضائے چمن کی گُل افشانیوں میں

جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تُو ہی تُو ہے!

شجر میں حجر میں گل و خار میں تُو — گلستاں میں تُو، برگ و بار میں تُو
بیابان و صحرا و گلزار میں تُو — عیاں وادی و دشت و کہسار میں تُو

جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تُو ہی تُو ہے!

نہیں گو بہ قیدِ مکان و زماں تُو — زمیں پر، فضا میں، سرِ آسماں تُو
کہوں کیا، کہاں ہے نہیں ہے کہاں تُو — نہاں تُو عیاں تُو یہاں تُو وہاں تُو!

جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تُو ہی تُو ہے!

جدھر دیکھتا ہوں، تجھے دیکھتا ہوں — نظر حسنِ جاں بخش پہ تیرے مفتوں
سرِ خاک و بالائے ایوانِ گردوں — بصد جلوہ ظاہر تری ذاتِ بیچوں

جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تُو ہی تُو ہے!

یہ کس کے جلوے ہیں سارے؟

فلک پہ مہر و مہِ پُر ضیا کے جلوے ہیں
زمیں پہ لالہ و گل کی ادا کے جلوے ہیں
بُتانِ مہر وش و مہ لقا کے جلوے ہیں
قسم خدا کی! غضب کے بلا کے جلوے ہیں
یہ سارے جلوے ہیں کس کے؟ خدا کے جلوے ہیں!

بتاؤ مہرِ منوّر میں نُور کس کا ہے؟
میانِ انجمِ تاباں ظُہور کس کا ہے؟
یہ تجھ میں اے دلِ شاعر! سرُور کس کا ہے؟
دماغِ فلسفی! تجھ میں شعُور کس کا ہے؟
یہ سارے جلوے ہیں کس کے؟ خدا کے جلوے ہیں!

نجومِ شب میں بلند اختری اُسی کی ہے

جو چاندنی میں ہے جاں پروری اُسی کی ہے

ضیا ہر ایک کُرہ میں بھری اُسی کی ہے

اُسی کا نُور ہے، جلوہ گری اُسی کی ہے

یہ سارے جلوے ہیں کس کے؟ خدا کے جلوے ہیں!

وُہی ہے رعد میں، بجلی میں اور بادل میں

اُسی کے دم سے ہے منگل ہر ایک جنگل میں

اُسی کی بُو ہے گُلوں میں اسی کا رس پھل میں

اُسی کی نکہتِ تر ہے صبا کے آنچل میں

یہ سارے جلوے ہیں کس کے؟ خدا کے جلوے ہیں!

ہر ایک برگِ چمن اُس کا ہے پتا دیتا

جو گل سے پوچھو، تو وہ بھی ہے مُسکرا دیتا

ہر ایک سرو جو اُنگلی ہے یوں اُٹھا دیتا

نشاں اُسی کا ہمیں ہے یہ بر مُلا دیتا

یہ سارے جلوے ہیں کس کے؟ خدا کے جلوے ہیں!

اُسی کا داغ ہے لالے کے دِل میں، دیکھو تو

وُہی ہے دیدۂ نرگس کے تِل میں، دیکھو تو

وُہی تو پھولوں کی ہے آب و گِل میں، دیکھو تو

لکھا ہے ہر وَرَقِ متصل میں، دیکھو تو

یہ سارے جلوے ہیں کس کے؟ خدا کے جلوے ہیں!

چمن میں، وحشت میں، وادی میں، کوہ و صحرا میں

کُہر میں، اولے میں، شبنم میں، ابر و دریا میں

شرر میں، شعلے میں، آتش میں، برقِ سینا میں

شمیمِ گل میں، نسیمِ مسرت افزا میں

یہ سارے جلوے ہیں کس کے؟ خدا کے جلوے ہیں!

اُسی کے جلوے ہیں سارے، جو چشمِ بینا ہو

تمام ذرّے ہیں تارے، جو چشمِ بینا ہو

وہ روبرو ہے ہمارے، جو چشمِ بینا ہو

بشر زباں سے پکارے، جو چشمِ بینا ہو

یہ سارے جلوے ہیں کس کے؟ خدا کے جلوے ہیں!

خطا کس کی ہے؟

غنچہ و گل میں ذرا دیکھ ادا کس کی ہے؟

سبزۂ تر میں لہک کس کی؟ فضا کس کی ہے؟

سرو و ریحاں میں بھلا، نشو و نما کس کی ہے؟

گہری سبزی جو ہے پتوں میں، ثنا کس کی ہے؟

جلوہ فرمائی یہ سب اُس کے سوا کس کی ہے؟

اب بھی شاداں نہ ہوا اے دل! تو خطا کس کی ہے؟

گلِ شاداب کا شیدا ہے بہت تُو اے دل!

ہنسنے والوں کی تجھے بھاتی ہے خُو بُو اے دل!

جانفزا تیرے لئے رنگ ہے، اور بُو اے دل!

روز و شب جوشِ بہاراں ہے ہر اک سُو اے دل!

کہیں نیلوفرِ خنداں، کہیں شبُّو اے دل!

اب بھی شاداں نہ ہوا اے دل! تو خطا کس کی ہے؟

ہے نظر پرورِ عشّاق جلالِ جاناں

جان لیتا نہیں، دیتا ہے ملالِ جاناں

سرسری سا بَتجھے رہتا ہے خیالِ جاناں

ورنہ مُشکل نہیں اتنا تو وصالِ جاناں

ذرّے ذرّے میں چمکتا ہے جمالِ جاناں؛

اب بھی شاداں نہ ہوا اے دل! تو خطا کس کی ہے؟

چہچہاتے ہیں پرندے چمنستانوں میں؛

مائلِ رقص ہیں طاؤس خیابانوں میں

وحش ہیں چوکڑیاں بھرتے بیابانوں میں

وہ بھی دلشاد ہیں جو رہتے ہیں ویرانوں میں

تجھ کو اللہ نے پیدا کیا انسانوں میں

اب بھی شاداں نہ ہوا اے دل! تو خطا کس کی ہے؟

آبشاروں کا ترنّم ترے بہلانے کو

لالہ زاروں کا تبسّم ترے بہلانے کو

دن کو ہنگامۂ مردُم ترے بہلانے کو

رات کو محفلِ انجم ترے بہلانے کو

مجھ کو دی تابِ تکلّم ترے بہلانے کو

اب بھی شاداں نہ ہوا اے دل! تو خطا کس کی ہے

چاندنی تیرے لئے اُس نے بنائی کیسی

خاک کے فرش پہ چادر یہ بچھائی کیسی

چرخ پر ماہ کی ہے جلوہ نمائی کیسی

رُخِ پُر نور میں اس کے ہے صفائی کیسی

دیکھ! صانع نے یہ صنعت ہے دکھائی کیسی

اب بھی شاداں نہ ہوا اے دل! تو خطا کس کی ہے

اور ایسے ہی ہزاروں ہیں نظارے دلکش

جانفزا ایک سے اِک، جتنے ہیں سارے دلکش

آتشِ حُسن کے آ دیکھ شرارے دلکش
ہیں سرِ ارض و سما پھُول ستارے دِلکش
کتنے دلچسپ ہیں، کیسے ہیں یہ پیارے دلکش!
اب بھی شاداں نہ ہو اے دل! تو خطا کس کی ہے؟

روز محروم ہی دَرس پڑھاتا ہو تجھے
سیکھنے کی ہیں جو باتیں وہ سکھاتا ہے تجھے
لے کے ہر روز جو ویرانے میں جاتا ہی تجھے
مرحلے راہِ حقیقت کے دکھاتا ہے تجھے
بات جو غیب سے سُنتا ہے سُناتا ہے تجھے
اب بھی شاداں نہ ہو اے دل! تو خطا کس کی ہے؟

—→✦←—

یعنی

تضمین بر غزل جنابِ طالب بنارسی

تجھے منزلِ دہر میں سوچ ذرا، یہ خیال ہے، خوف و خطر ہی نہیں
ترے سر پہ تنی ہوئی تیغِ قضا، وہ ہی جس سے کسی کو مفر ہی نہیں
ترا دائمی گھر ہے یہ دارِ فنا؟ کہ سوادِ بقا پہ نظر ہی نہیں
سرِ کوچۂ حرص و ہوا سے ترا، سوئے راہِ نجات گذر ہی نہیں
اسے جانے تو کیا اے اسیرِ بلا، تجھے آپ جب اپنی خبر ہی نہیں

یہ جو صدمۂ دردِ فراق سہا، تو قصور ہوا اس میں ترا ہی ترا

تری عقل پہ پردہ کچھ ایسا پڑا، کہ خیالِ دعا و دوا نہ رہا

یہ خودی نہیں موت ہے مردِ خدا، کہ یہ دینی ہی جانِ جہاں کو چھپا

جو خودی کے مرض سے رہے تو جدا، تو ہو سامنے جلوۂ نورِ خدا

ابھی پردۂ رُخ وہ اُٹھا دے مگر، ترے جذبۂ دل میں اثر ہی نہیں

پئے عزّت و شوکت و حشمت و زر، تو جہان میں پھرتا ہی خاک بسر

ترے کیسۂ دل میں ہیں لعل و گہر، یونہی مٹّی تو اپنی خراب نہ کر

تری آبرو ہے ترے پاس مگر، تجھے رازِ دروں کی نہیں ہی خبر

تجھے آبرو کا ہے خیال اگر، تو بھٹک نہ تو بحرِ جہاں میں بشر

کہ جو قطرہ صدف میں بنائے نہ گھر، وہ گہر ہی نہیں وہ گہر ہی نہیں

کبھی ابرِ کرم سے نہ بوند گری، ہوئی آہ! نہ شاخِ امید ہری

ترے دل کی کلی نہ کھلی نہ کھلی، ترے باغ میں موجِ صبا نہ چلی

نظر آئی نہ صبحِ وصال کبھی، شبِ غم نہ ٹلی، نہ ٹلی، نہ ٹلی

جسے ڈھونڈھ رہا تھا حرم میں کبھی کبھی دیر میں جس کی تلاش رہی

رگِ جاں سے وہ تیری قریب رہا، تری آنکھیں نہیں ہیں نظر ہی نہیں

تو ہے مہر مگر ہوا تجھ کو یہ کیا، کہ بصورتِ ذرّہ ہے جلوہ نما

ترا آئینہ زنگ میں چھپنے لگا، اسے دے کے جلا وہی روپ دکھا

ترے سامنے ہی یم صدق و صفا، یہیں غوطہ لگا، یہیں غوطہ لگا

جو ہے قطرۂ بحرِ عمیقِ بقا، تو بہ شکلِ حباب نہ سر کو اُٹھا

کہ جو سیلِ طریقتِ حق میں ملا، وہ اُٹھا سکے سر یہ جگہ ہی نہیں

نہ ہو کشتۂ تیغِ ثواب و خطا، نہ تڑپ نہ خنجرِ بیمِ و رجا

نہ تو گنگ کو جا نہ جمن میں نہا، کسی دشت کی جا کے نہ خاک اُڑا

نہ ہی بن میں تو بیٹھ کے دھونی رما، نہ بدن پہ تو اپنے بھبوت لگا

نہ تو دیر و حرم کے طواف کو جا، نہ تو صدمۂ دور و دراز اُٹھا

جسے دل کے وطن میں وہ یار ملا، اُسے حاجتِ رنجِ سفر ہی نہیں

نہیں طالعِ نیک جو ساتھ سدا، نہ نصیب ہُما نہ قضا کی خطا

تُو ہے آپ ہی اپنا حسُود ہُوا، تجھے اپنے کئے کی ہے ملتی سزا

تُو اک ایسے عدُو کو ہے پال رہا، ترے خونِ جگر سے ہی جسکی غذا

ترے بر میں جو موذی ہے نفس ترا، اُسے مار گرا، اُسے مار گرا

یہ وہ بد ہے بلا، یہ وہ بد ہے بلا، کوئی مُدّعی اس سے بتر ہی نہیں

اُٹھو دیکھو جہان خراب ہے یہ، نہیں زیست خمارِ شراب ہے یہ

نہیں منزلِ عیش جناب ہے یہ، اُٹھو۔ جاگو کہ دارِ عذاب ہے یہ

پڑھی جائے نہ ایسی کتاب ہے یہ، کہ ازل سے عدم کا جواب ہے یہ

یہ گہر تو نہیں ہے حُباب ہے یہ، یہ جہاں نہیں عالمِ خواب ہے یہ

نہیں آب ہے بلکہ سُراب ہے یہ، اسے چھوڑے بغیر گذر ہی نہیں

نہ بہارِ نشاطِ دو روزہ پہ مر، کہ ہے باغِ جہاں میں خزاں کا گذر

یہ طلسم ہے سارا فریبِ نظر، نہ ہے غُنچۂ تر۔ نہ شجر۔ نہ ثمر

جو رکھے تو تاب جہاں کی خبر، تو اُٹھائے کبھی نہ ملالِ ضرر
رہا طالبِ عیشِ فنا تو اگر، تو حریمِ بقا کی امید نہ کر
یہ وہ دام ہے جس سے گذر ہی نہیں یہ وہ شام ہے جس کی سحر ہی نہیں
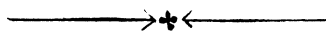
سُرورِ ازل

شہنشاہ بابر اور گورو نانک دیو کا مکالمہ

بابر

ہماری بزمِ عشرت میں جو لے آیا خدا، بابا!
تو بسم اللہ! جامِ بادۂ احمر چڑھا، بابا!

جہاں میں آبِ رز سے کونسا ہے پاک تر پانی
کہ دُھل جاتا ہو جس سے دفترِ ما و شما، بابا!

نہ مَیخانے کو دیکھا چاہیے چشمِ حقارت سے
کہ ہوتی ہے یہیں سے بے خودی کی ابتدا، بابا!

نہ یُوں ہی مَیکشوں کو خاک پر بیٹھا ہُوا دیکھو
پُہنچتی ہے نظر اُن کی سرِ فوق السّما، بابا!

صدائے حق کی سُنتے ہیں سدا وہ شیشۂ مَے سے
اِسی سے دل ہیں رندوں کے حقیقت آشنا، بابا!

صُراحی کھولتی ہے رازِ دل جب بانگِ قُلقُل سے
فلک سے ہیں پکار اُٹھتے ملائک مرحبا، بابا!

نہ ہو گلبانگ مستوں کی تو دُنیا بزمِ ماتم ہے
ہمارے دم سے کچھ زندہ ہے دارالفنا، بابا!

غنیمت جان کر صحبت کو اک دو جام پیتا جا!
میانِ محفلِ رندان دُرد آشام پیتا جا!

گورو نانک دیو

مبارک ہو مئے احمر تجھے صاحبقراں تیری
رکھے بس سرخرو تجھ کو شرابِ ارغواں تیری
دلِ فرخندہ تیرا واقفِ رمزِ حقیقت ہے
اگر ہے ترجمانِ دل حقیقت میں زباں تیری
مگر جب کیفیت دل میں ہو کیفِ مے کی حاجت کیا
غرض محفل سے کیا؟ خلوت ہو جب رشکِ جناں تیری
مئے انگور پی کر کوئی متوالا ہوا تو کیا؟

رہا بے کیف دل، شغلِ مے و مینا ہُوا تو کیا؟

وہ مے اپنی ہے جس سے بن پئے مخمور رہتے ہیں
خیالِ چشمِ ساقی کے نشے میں چُور رہتے ہیں

وہ میکش ہیں، کہ مہر و ماہ اپنے جام و ساغر ہیں
جو صہبائے مروّق سے سدا بھرپور رہتے ہیں

ہمارا دورِ مے ہر ہر نفس کے ساتھ چلتا ہے
اسی سے ہر نفس، ہر لحظہ ہم مسرور رہتے ہیں

کثافت رُوح میں آلائشِ دُنیا سے آتی ہے
شرابِ ظاہری سے اہلِ باطن دُور رہتے ہیں

چڑھا دو اُن کو سُولی پہ بھی، تو حق حق سُناتے ہیں
جو عاشق ہیں وہ سرشارِ مے منصور رہتے ہیں

لنڈھائے ہوں جنہوں نے خُم کے خُم صہبائے عرفاں کے
کہاں وہ طالبِ افشردۂ انگور رہتے ہیں

مناسب ہے یہی، ترکِ مئے انگور کر شاہا!
ہمارے جام سے تھوڑی سی اب منظور کر شاہا!

جذباتِ فطرت

مبارکبادِ نوروز

عشرت ہے صلائے عامِ نوروز خورشید سحر ہے جامِ نوروز

ہے بارشِ انبساط ہر سُو عالم میں ہے فیضِ عامِ نوروز

اٹھلاتی ہوئی نسیم آئی وہ پیکِ سُبک خرامِ نوروز

سُنتے ہی یہ مژدہ کھل گئے پھول "لایا ہے کوئی پیامِ نوروز"

چھیڑا وہیں نغمۂ مسرّت بُلبل نے سُنا جو نامِ نوروز

لالے نے اُٹھا لیا پیالہ بھر کے لعل فامِ نوروز

خوبانِ چمن ہیں محفل آرا زوروں پہ ہے اہتمامِ نوروز

منزل گہِ نوبہار ہے یا ہے صحنِ چمن مقامِ نوروز
طائر ہوئے قیدِ غم سے آزاد ہو کر پابندِ دامِ نوروز

لہراتے ہیں مل کے یہ ترانہ
نوروز! ترا مُبارک آنا!

آنا نوروز کا مُبارک! دُنیا کو ہو دن نیا مُبارک!
خوش آمدی اے نگارِ نوروز مقدم تیرا بنا مُبارک!
ہے جلوہ فروز مہرِ نوروز یہ طلعتِ جانفزا مُبارک!
عالم ہے نگار خانۂ چیں یہ منظرِ دل کُشا مُبارک!
مرغانِ سحر ہیں نغمہ پیرا دیتے ہیں جہاں کو یا مُبارک!
ہو سال نیا نشاط کا سال اس سال کی ابتدا مُبارک!
ہر لحظہ ہو مایۂ سعادت ساعت نہ ہو ایک نامُبارک!
ہر روز سُنیں نئی بشارت کانوں میں پڑے صدا مُبارک!

گونجے دنیا میں یہ ترانہ!
نوروز! ترا مبارک آنا!

مہاتما بدھ

ایوانِ شاہی میں آخری رات

اے زمینِ خاک برسر! یوں نہ ہو اندوہ گیں
میں شریکِ غم ہوں تیرا، ہوں تری خاطر حزیں
تیری خاطر، اور تیرے بچوں کی خاطر اے زمیں!
مضطرب ہوں میں، مرے دل کو قرار اصلا نہیں
نیم بسمل میں بھی ہوں، تو ہے اگر نخچیرِ غم!
لے لیا اپنے جگر پر میں نے تیرا تیرِ غم!

ماتمی صورت ہے تیری اے سیہ پوشِ آسماں

تُو گھٹا ہے سوزِ غم کی، یا ہے آہوں کا دھواں

اشکِ خوں دامن پہ ہیں، یا ہیں شفق کی سرخیاں

داغِ تاباں ہیں مہ و خورشید سینے میں عیاں

تُو ہے محزوں اہلِ عالم کی مصائب دیکھ کر

شامِ غم، صبحِ قیامت ہیں مرے شام و سحر

اے ستارو! تم سراپا ہو کے چشمِ انتظار

دیکھتے ہو میری جانب، صورتِ اُمید وار

لو اب آیا میں، اب آیا، تم پہ ہونے کو نثار

کب سے ہوں آوارگی کی آرزو میں بیقرار

آہ میں جکڑا ہوا سونے کی زنجیروں میں ہوں

ہر گھڑی آزاد ہو جانے کی تدبیروں میں ہوں

عشرتِ ایّامِ آغازِ جوانی ! الوداع
الوداع اے ذوق و شوقِ عیشِ فانی ! الوداع
الوداع اے تاج و تختِ مرزبانی ! الوداع
الفراق اے خورّمی، اے شادمانی ! الوداع

الوداع اے حسرتِ لیل و نہارِ آرزو
اے دلِ غم دیدہ بن جا تُو مزارِ آرزو

آہ ! پر تیری جدائی آہ ! او آرامِ جاں
اُف ! تڑپتا ہے، مچلتا ہے دلِ ناشاداں
تجھ کو سوتا چھوڑ جاؤں سنگ دل ایسا کہاں
آئینہ رُو ! تیری فرقت مجھ پہ ہے کوہ گراں

عزمِ راسخ ہے مگر مُنہ تجھ سے موڑوں کس طرح؟
رشتۂ عہدِ وفا کو آہ ! توڑوں کس طرح؟

تیری فرقت اور پھر اُس گوہرِ شہوار کی
اپنی تابش سے ہے جو تزئینِ تاجِ خسروی
جس کو نیسانِ محبت نے عطا کی زندگی
آب و تابِ زیست بڑھ جائیگی جس سے واقعی
شمعِ دل افروز ہوگا خانۂ جاں کے لئے
مایۂ نُورِ بصارت چشمِ حیراں کے لئے

اے فریبِ اُلفتِ فانی! نہ تو بھٹکا سکے مجھے
آہ اے جھُوٹی محبت! دے نہ اب دھوکا مجھے
دیدنی ہے روئے گل پر اس سے مطلب کیا مجھے
گھر نظر آیا ریاضِ دہر کانٹوں کا مجھے
یہ کشاکش ہائے بے جا ہیں سلاسل کی طرح
توڑ دوں ان کو طلسمِ نقشِ باطل کی طرح!

رخصت اے ماں باپ بیوی رخصت اے اہلِ دیار!

دیکھنا میری جدائی پر نہ ہونا اشکبار

کی تمہارے ہی لئے میں نے یہ فرقت اختیار

دیکھئے کیا کیا دکھائے گردشِ لیل و نہار

المدد! اے جستجوئے صادقِ راہِ نجات

کونسی خلوت میں ہے اے شمعِ رازِ کائنات؟

سرورِ جہاں آبادی

اے سرورِ نکتہ داں! اے شاعرِ رنگیں بیاں

اے کہ گلریزی سے تیری ہند ہے باغِ جناں

بزمِ رازِ عالمِ بالا کا ہے تُو رازداں

تیرے نغموں پر لگے رہتے ہیں گوشِ قدسیاں

حق نے بخشا ہے تجھے جان بخش اعجازِ سخن
چٹکیاں لیتا ہے دل میں تیرا اندازِ سخن

سحر ہے، افسوں ہے، جادو ہے تیری گفتار میں
معنیٔ تاثیر پنہاں ہیں ترے اشعار میں
گُل کو رنگت تیری رنگینی سے ہے گلزار میں
تیری طبعِ موج زا کی موج ہے انہار میں

ہر نفَس میں ہے ترے کیا کیا مسیحا پروری
ہند کو حاصل ہے جو کتے آسماں پر برتری

شاہدِ مضموں میں تیرے شوخیٔ جانانہ ہے
ہر ادا مستانہ ہے، ہر ناز معشوقانہ ہے
شمعِ معنی پر تری بزمِ سخن پروانہ ہے
داستاں جو ہے، دل پر سوز کا افسانہ ہے

ہُوک اُٹھتی ہے جگر سے تیری اِک آہ پر
تیر سے آکر برستے ہیں دلِ آگاہ پر

شاہدِ تحریر کا حُسن جاں فزا دیکھے کوئی
یا تری تحریر میں تیری ادا دیکھے کوئی
سازِ بزمِ راز کی سُن کر صدا دیکھے کوئی
ہے یہ کس کا نغمۂ رنگیں ذرا دیکھے کوئی

"نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا" (غالبؔ)

ساقیٔ بزمِ سخن کے گو ہیں متوالے بہت
ہیں عروسِ شاعری کے چاہنے والے بہت
روتے ہیں چھم چھم دلوں میں پھوٹ کر چھالے بہت
اُٹھتے ہیں دستِ دعا بن بن کے گو نالے بہت

ہے مگر وہ شاہدِ رعنا ترے آغوش میں
جوششِ گریہ کا عالم غیر کے سر جوش میں!

حُسنِ معنی کی جھلک جلوہ ہے برقِ طُور کا
طبع روشن سے تری روشن ہے مضمون دُور کا
نت نیا پردہ اُٹھا کر طلعتِ مستُور کا
اہلِ عالم کو دکھاتا ہے تماشا نُور کا

دل ترا ہے یا کہ ہے گنجینۂ اسرارِ حق
یہ زباں ہے یا کہ ہے آئینۂ اسرارِ حق!

جو طبیعت میں تری ہے گُل میں رنگینی کہاں
شعرِ نازک کو ترے پہنچے بُتِ چینی کہاں
نکتہ چینوں کے لئے جائے سخن چینی کہاں
مجمعِ خوبی ہے تو بد بین و بد بینی کہاں

نثر پر تیری کروں عقدِ ثریا کو نثار

نظم پر قرباں تری صد سلکِ دُرِّ شاہوار!

ہے ترے نغموں سے باقی ہند میں شانِ سخن

ہو قیامت تک نہ بے یوسف یہ کنعانِ سخن

اے سرودِ نغمہ بار! اے ابرِ نیسانِ سخن

ہے برسنے سے ترے سرسبز بُستانِ سخن

کلکِ گُل افشاں ترا کر لے اگر عزمِ نشاط

ہند کی اُجڑی ہوئی نگری ہو پھر بزمِ نشاط!

مرگِ آزادی پہ اِک ماتم بپا بھارت میں ہے

رونا دھونا شاعرانِ ہند کی قسمت میں ہے

ماری ماری آہ پھرتی ہے عجب آفت میں ہے

حاجبِ بابِ اجابت نشۂ غفلت میں ہے

کارواں نالوں کا بھیجیں کر کے اک تیار ہم
تیرے نالوں کو بنا دیں کارواں سالار ہم!

تجھ کو زیبا نازشِ بے حد، جہاں آباد ہے
تجھ میں ایسا مایۂ فخرِ جہاں آباد ہے
کیا مبارک شہر ہے تو، وہ جہاں آباد ہے
دم سے جس کے نظمِ اردو کا جہاں آباد ہے

تیری گلیوں میں جو کوئی جلوہ پیرائی کرے
کیوں طواف آ کر نہ کوئی تیرا شیدائی کرے!

دہر میں جب تک بوئے گلہائے فن باقی رہے
نظمِ اردو کا پھلا پھولا چمن باقی رہے
مایۂ دارِ رونقِ بزمِ سخن باقی رہے
یادگارِ مشربِ دورِ کہن باقی رہے

جی میں آتا ہے کہ آ کر چُوم لوں تیرے قدم
آہ لیکن جاں گزا ہے دُوریٔ منزل کا غم!

فلکِ اخضری ہے جام مِرا

تھوڑی سی شرابِ خندۂ گُل
رنگیں جس سے کہ ہو تخیّل

پیمانۂ برگِ یاسمن میں
یا ساغرِ لالۂ چمن میں

جس سے کہ خبر نہ ہو دہاں کو
کر لیجئے تازہ کامِ جاں کو

صہبائے شفق کے جام دو جام
پانی جس سے شرابِ گلفام

وہ بادۂ خوشگوارِ لعلیں
عالم نظر آئے جس سے رنگیں

یا صبح کی وہ مئے نظارا
ہو جس سے چمک میں مانندِ تارا

چُپ چاپ خموشیٔ سحر میں
پی جایئے بس نظر نظر میں

خُم خانۂ اخضرِ کہن کی — جس میں ہو چمک دمک کرن کی

جامِ مہتاب سے چھلک کر — چھینٹے چھینٹے گرے زمیں پر

ہر مست بہ قدرِ ظرف پی لے — اور لطفِ سرورِ بیخودی لے

محروم بھی بہرہ یاب ہو جائے — مستِ مئے فکر تاب ہو جائے

او ساقیٔ بزمِ میگساری!

کافی ہے مجھے یہ بادہ خواری!

بزمِ سُہا

سکوتِ شام میں جب دل رہینِ یاس ہوتا ہے

نظر آتی ہے دُنیا مائلِ خوابِ فنا مجھ کو

در و دیوار پر ہُوں دیکھتا وحشت برستی سی

دکھاتا ہے یہ عالم عالمِ دشتِ بلا مجھ کو

سیہ بختی میں ظلمت سے اضافہ اَور ہوتا ہے
سوادِ شام کا ہر سین ہے حسرت فزا مجھ کو

بہت جب تنگنائے دہر میں گھُٹتا ہے دم میرا
تصوّر لے کے اُڑتا ہے سوئے بزمِ سُہا مجھ کو
زمیں سے اُڑ کے بن مُرغِ نظر کے ساتھ جاتا ہوں
طفیلِ واقفیّت کچھ نہیں یہ فاصلہ مجھ کو
نکل کر خاک دانِ تیرہ سے دلشاد ہوتا ہوں
کیا ہے صانعِ مطلق نے طلعت آشنا مجھ کو

نظر آتا ہے کیا کیا ہر طرف اک نور کا عالم
زمیں سے دُور تاروں میں سراجِ سما مجھ کو

وہاں ہوتا قیامِ دائمی میرا، تو پھر ہوتا
نہ کچھ بیمِ اجل مجھ کو، نہ کچھ وہمِ فنا مجھ کو
درخشاں اے ستارو! تا ابد تم کو خدا رکھّے
نظر آتا ہے تم میں جلوۂ نورِ بقا مجھ کو!
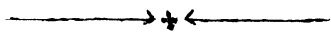
ایک آرزو

آہ! یہ دُنیا کے جھگڑے اور یہ فکرِ بیش و کم
بیقرار یہائے اُمّید، مُسرّت، خوفِ غم
خارِ پہلو حسرتِ آرام و راحت رات دن
آرزوئے عیش و عشرت، رنجِ عسرت رات دن

ہر قدم پر آہ! نیرنگِ جہاں کا سامنا
شعبدہ آرائیہائے آسماں کا سامنا

ہے کہیں جور و جفا مہر و وفا کے رُوپ میں
اور کہیں مکر و دغا صدق و صفا کے رُوپ میں

شعلہ ہائے آتشیں کین و حسد کے ہیں کہیں
طعنہ ہائے زہر آگیں نیک و بد کے ہیں کہیں

زالِ دُنیا کی محبت دشمنِ صبر و سکوں
ناشکیبائی جگر میں دل میں اندازِ جنوں

یعنی مثلِ گیسوئے برہم پریشانی کبھی
صورتِ آئینۂ رُخسار حیرانی کبھی

ہرزہ کاری میں کٹے افسوس! ساری زندگی
آہ! یُوں برباد ہو جائے یہ پیاری زندگی

رُوحِ مضطر کو کسی ایسی جگہ لے جاؤں مَیں
کشمکش سے چھوٹ جاؤں اور تسکیں پاؤں مَیں

جو یہاں درپردہ ہے وہ آشکارا ہو جہاں
حُسنِ مطلق بے تکلّف جلوہ آرا ہو جہاں

آسماں سے روز و شب رُوحانیت برسا کرے
اور دِلِ محبوس اپنی کھڑکیوں کو وا کرے

پاک ہو جائے جہاں آلائشِ دُنیا سے دِل
جوڑ دے اپنا تعلّق عالمِ بالا سے دِل

صبح دم جنّت کے پھُولوں سے جہاں آئے شمیم
اور جہانِ قدس کا پیغام دے بادِ نسیم

حمد کے اشعار گاتے ہوں طیورِ خوش نوا
نغمہ ہائے سرمدی کا اِک تلاطُم ہو بپا!

مَوت

اے موت! جور سے ترے نالاں زمانہ ہے
عالَم یہ تیرے، تیرِ ستم کا نشانہ ہے
روزِ ازل سے طَور تیرا قاتلانہ ہے
خُوں سے لکھا ہؤا ہے، جو تیرا فسانہ ہے
جو قافلہ ہے، یاں سے عَدَم کو روانہ ہے
ہر اِک کا تیری راہ میں لُٹنا خزانہ ہے

برباد سازِ رونقِ بزمِ جہاں ہے تُو
اے مَوت! غایتِ سِتَمِ آسماں ہے تُو

اے مَوت! بحر و بر پہ ہے سکہ رواں ترا
ظالم! مطیعِ حکُم ہے سارا جہاں ترا

راہِ جفا پہ کوئی نہیں ہمعناں ترا

توسن رواں ہے صورتِ برقِ تپاں ترا

کچھ کچھ شریکِ جور ہے گو آسماں ترا

لیکن وہ دُوں خصال بھی ثانی کہاں ترا

تُو پھول توڑ لیتی ہے اُس کے چمن سے بھی

ہر صبح ہے رُخِ مہ و انجم پہ مُردنی!

تیغِ ستم سے تیری کسی کو اماں نہیں

تجھ کو تمیزِ طفلک و پیر و جواں نہیں

تجھ کو ذرا غمِ اہلِ جہاں نہیں

کچھ دل میں تیرے رحم و کرم کا نشاں نہیں

تجھ سے بچا کوئی چمن و گلستاں نہیں

تُو برقِ بیخ سوز ہے، بادِ خزاں نہیں

اِک بار تُو گرے جو کسی نونہال پر
آئے نہ پھر بہاریں وہ اپنے حال پر!

ماتم کدہ یہ دہر جو ہے، تیرے دم سے ہے
ویراں ہر ایک شہر جو ہے، تیرے دم سے ہے
دریائے غم میں لہر جو ہے، تیرے دم سے ہے
نالوں میں لہر بہر جو ہے، تیرے دم سے ہے
امرت جہاں میں زہر جو ہے، تیرے دم سے ہے
جلیا خدا کا قہر جو ہے، تیرے دم سے ہے

جو دل ہے تیرے داغ سے یاں لالہ زار ہے
ماہی سے ماہ تک جو ہے، سوداغدار ہے

دنیا سے کیسے کیسے اُٹھے گلعذار حیف!
تھی جن کے دم سے رونق فصلِ بہار حیف!

کیا کیا سمندِ ناز کے تھے شہسوار حیف!

اے موت! تُو نے سب کا اُڑایا غبار حیف!

اب ہے دمَن نہ لیلیٰ اُلفت شعار۔ حیف!

ڈھونڈے سے بھی ملے گا نہ اُن کا مزار حیف!

سنتے ہیں آج جن کے فسانوں کو ہم غریب

نالاں ترے ستم سے گئے وہ ستم نصیب

کیا کیا نہ دل میں حسرت و ارمان لے گئے

پہلو میں آرزوؤں کے پیکان لے گئے

عقدے تمام مشکل و آسان لے گئے

شغلِ عدم کے سینکڑوں سامان لے گئے

جب لوگ اُن کو پھونکنے شمشان لے گئے

یا گاڑنے کو سوئے بیابان لے گئے

ماتم تھا آرزو کا جنازے کے ساتھ ساتھ

تھا شور ہاؤ ہو کا جنازے کے ساتھ ساتھ!

مارا کسی غریب کو تُو نے وطن سے دُور

ماں باپ سے بہت پرے، بھائی بہن سے دُور

لاشہ کوئی پڑا ہے مزار و کفن سے دُور

دستِ صدائے شیون و شورِ محن سے دُور

پھولوں کی آہ ناز بھری انجمن سے دُور

گھونٹا گلا ھزار کا صحنِ چمن سے دُور

گھیرا کسی کو ورطۂ دریا کے درمیاں

پھانسا کسی کو دامنِ صحرا کے درمیاں

اے موت! جن کا قطب سے تا قطب راج تھا

خورشید طشتِ زر جنہیں دیتا خراج تھا

ہم رفعتِ کلاہِ فلک جن کا تاج تھا
با صد شکوہ زیرِ قدم تختِ عاج تھا
قانون جن کا لفظ، اشارہ رواج تھا
والا حشم کوئی، کوئی عالی مزاج تھا
اُن کو بھی تُو نے تخت سے پھینکا اُتار کے
آئی دیاؤ میں نہ کسی شہریار کے

رستم کا اب نشاں ہے، نہ اسفندیار کا
ملتا نہیں پتا کہیں اُن کے مزار کا
سُنتے ہیں ذکر ارجُنِ گردوں وقار کا
تھا نام ایک منتخب روزگار کا
ہنگامہ جس سے گرم رہا کارزار کا
اِک تیر چیرتا تھا کلیجہ ہزار کا

آخر نشانہ ہو کے رہا تیرے بان کا
تُو نے ہی خاتمہ کیا تیر و کمان کا

ہے غم سے جاں بلب کوئی حرماں نصیب آہ!
تو لے گئی ہے پہلو سے جس کا حبیب آہ!
روتا تڑپ تڑپ کے ہے بے کس غریب آہ!
آزارِ ہجر کا نہیں کوئی طبیب، آہ!
اے موت! تیرے کام ہیں کتنے مہیب، آہ!
مارا ہے اُس غریب کو بن کر رقیب، آہ!

جس دن سے تُو نے اُس سے کیا ہم نشیں جُدا
ہوتی ہی چشمِ تر سے نہیں آستیں جُدا

تُو جس کا بچّہ لے گئی، اُس ماں کا حال دیکھ
جاری ہیں اشک، اگرچہ ہوئے ماہ و سال دیکھ

اے موت! دیکھ طولِ زمانِ ملال دیکھ
اب تک اٹے ہیں راکھ سے سب سر کے بال دیکھ
ایسی بھی غمزدوں کی کہیں ہے مثال دیکھ
ہر وقت رونے دھونے سے آنکھیں ہیں لال دیکھ

نورِ نظر کے غم میں یہ اتنا جو روئے گی
آنکھیں تو خیر، جان کو اک روز کھوئے گی

اے موت! آہ تیرے ستائے ہوئے یتیم
نقشِ غلط کی طرح مٹائے ہوئے یتیم
وہ سیلِ اشکِ خوں میں نہائے ہوئے یتیم
سوزِ غمِ نہاں کے جلائے ہوئے یتیم
دوشِ پدر سے خاک پہ آئے ہوئے یتیم
گودی سے ماں کی آہ! چھڑائے ہوئے یتیم

روتے ہیں اور دیتے ہیں رو رو دُعا تجھے
اُن کو رُلا کے موت بھلا کیا ملا تجھے

عاشق کو آ کے حُسن کا جلوہ دکھا گئی
دل آ گیا کسی پہ تو بس موت آ گئی

پروانے کے شکار کو شمعیں جلا گئی
گُل بہرِ عندلیب چمن میں کِھلا گئی

جھونکوں میں جب نسیمِ سحر کے سما گئی
دم میں چراغِ ہستیٔ گل کو بجھا گئی

صیّاد بن کے مُرغِ چمن زاد پر گری
اور برق ہو کے خانۂ صیّاد پر گری

اے موت! مت ڈرا مجھے، مجھ کو فنا نہیں!
جلنے کا مجھ پہ نام کو جادُو ترا نہیں

کچھ ابتدا نہیں ہے، مری انتہا نہیں

مَیں وہ ہوں مجھ سے چھیڑ کی لینا بجا نہیں

تیری رسائی جسم سے آگے ذرا نہیں

ہاں جسم تیرا مال ہے، بیشک مرا نہیں

شمشان! تیری آگ مجھے کب جلا سکے!

آغوشِ قبر! تُو مجھے کیوں کر دبا سکے!

مَوت کا موسم

(ترجمہ از انگریزی)

موسمِ خاص میں ہوتے ہیں شجر برگ فشاں

پھُول مرجھاتے ہیں، جب باغ میں آتی ہے خزاں

صبح کے ہونے پہ ہوتے ہیں ستارے پنہاں
لیکن اے موت! مقرّر ہے ترا وقت کہاں

(۲)

دن کو ہوتا ہے ہر اک کو غمِ دنیا سے کام
دوست مل جائیں بہم آتی ہے اس واسطے شام
رات ہوتی ہے کہ ہو سب کو میسّر آرام
لیکن اے موت! ترے آنے کے ہیں وقت تمام

(۳)

ہم کو معلوم ہے کب بدر کو ہونا ہے ہلال
اُڑ کے کب جانا پرندوں کو ہے پھر سوئے شمال
ہونا گلشن کو ہے کب بادِ خزاں سے پامال
کون بتلائے کہ کب ہے تجھے ترا استقبال!

(۴)

کیا وہ موسم ہے ترا جبکہ بہار آتی ہے
اور صبا حُسنِ گُلِ تر کو نکھار آتی ہے
یا کہ جب بادِ خزاں لے کے غبار آتی ہے
نہیں، ہر فصل میں تُو بہرِ شکار آتی ہے

(۵)

بحر و بر دو نو کو منظور اطاعت تیری
کر رہی کام ہوائیں بھی ہے طاقت تیری
دل سے راحت میں بھی جاتی نہیں ہیبت تیری
ہم جہاں جائیں نظر آتی ہے صورت تیری

(۶)

تُو وہاں بھی ہے جہاں ملتے ہیں دو سینہ فگار
دُکھڑے رونے کے لئے بیٹھ کے زیرِ اشجار
تُو وہاں بھی ہے جہاں ملتی ہیں فوجیں خونخوار
اور جوہر ہے جہاں اپنے دکھاتی تلوار

بُوئے گُل

فضائے دامنِ گُل میں ملا مقام تجھے
ہُوا نصیب نہ لیکن وہاں قیام تجھے
بہ ایں لطافت و جاں پروری و زیبائی
کیا بوقتِ سحر عزمِ دشت پیمائی

وطن سے دوشِ صبا پر سوار ہو کے چلی
چمن سے مشک فشاں، عطر بار ہو کے چلی

ترے نفس سے ہوا مایہ دارِ مستی ہے
یہ فصلِ گل ہے کہ دورانِ مے پرستی ہے
مئے سرور ٹپکتی ہے جام سے تیرے
ہے سب کو بہرہ وری فیضِ عام سے تیرے
غضب کی اُف! تری لپٹوں میں ہے فسونکاری
دل و دماغ پہ اک بے خودی سی ہے طاری

ہے مجھ کو تیرے مقدّر پہ سخت حیرانی
جہاں کو مایۂ فرحت تری پریشانی

ریاضِ دہر میں خود ہو کے انتشار نصیب
مشامِ خلق کو تُو نے کیا بہار نصیب
اُجڑ کے خود جو ہوا کو بسا دیا تُو نے
سبق زمانے کو ایثار کا دیا تُو نے!

انجامِ گُل
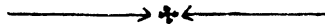
کل تک تُو چمن میں ہنس رہا تھا
وہ خندہ عجیب جانفزا تھا
شیدائی تھے سب طیورِ گلشن
ہر نغمۂ خوش تری ثنا تھا
بلبل کا تو خاص رشتۂ جاں
ہستی سے تری بندھا ہوا تھا
مطلب نہیں اس سے ہم کو اے گُل!
شیوہ ترا لطف یا جفا تھا

معشوق تھا بے نظیر و رعنا ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ تُو شاہدِ شکّریں ادا تھا

غارت گرِ ہوش و صبر و تمکیں ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ عالم تیرے شباب کا تھا

خوبانِ جہاں کا ہے یہ آئین ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ یہ عیب نہیں کہ خود نما تھا

ظالم کے نہ دل میں رحم آیا ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ گلچیں ترے واسطے قضا تھا

کتنا، اے شاہدِ دل آرام ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ آغاز سے مختلف ہے انجام

کس حال میں آہ! آج تُو ہے ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ وہ خوبئے رنگ ہے نہ بُو ہے

بکھری ہوئی چند پتّیاں ہیں ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ نکہت آوارہ سُو بسُو ہے

اے گُل! وہ ادائیں اب کہاں ہیں ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ بلبل اب بھی تو رُو برُو ہے

مُنّہ بولتے اُف! وہ ناز تیرے ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ اب بزم تری مقامِ ہُو ہے

کیوں خاک بروُ ہے روئے برخاک ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ حُسنِ رفتہ کی جُستجُو ہے؟

کل تک شیدا تھا اک زمانہ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ بیگانگی آج سب کی خُو ہے

سب آبرُو و آب تاب تک ہے ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ یہ دہر طلسمِ رنگ و بُو ہے

آغازِ گُل اور اُس کا انجام
حالت یہی سب کی ہو بہو ہے

آغاز ہے دلنواز سب کا
انجام ہے جاں گداز سب کا!

آغاز مہِ مسرّتِ تام
انجام شبِ سیاہِ آلام

آغاز شگفتنِ گُل تر
انجام فشارِ حُسنِ گلفام

آغاز طلوعِ صبحِ انور
انجام سوادِ آمدِ شام

آغاز نگاہِ لطفِ ساقی
انجام شکستِ شیشہ و جام

آغاز وہ عہد ہے کہ جس کا
سب جانتے ہیں طفولیت نام

انجام وہ دَور ہے جس کو
کہتے ہیں بد ترینِ ایّام

آغاز ہوائے شوقِ پروانہ
انجام فریبِ دانہ و دام

آغاز وہ ہے کہ ہائے آغاز!
انجام وہ ہے کہ وائے انجام!

آغاز انجام دیکھ گُل کا
نقشہ یہی جان جزو و کُل کا!

ایک خاندان کی قبریں

(ترجمہ از انگریزی)

(۱)

پروان ایک گھر میں چڑھے ایک ساتھ وہ
معمور اُن کے دم سے تھا کاشانہ ایک ہی
حائل ہیں درمیان میں اب دشت و بحر و کوہ
اِک دوسرے سے دور ہیں قبریں جُدی جُدی

(۲)

اِک مادرِ شفیق! کہ اُٹھ اُٹھ کے رات کو
تھی مامتا سے ہر رُخِ زیبا پہ جھانکتی

مُنہ بند غنچے آہ! جو تھے اُس کے رُوبرُو
وُہ خُفتگانِ ناز ہوئے محوِ نیستی

(۳)

جنگل میں ایک ہے نئی دنیا کے سو رہا
دریا کنار، سبزۂ اخضر کے سائے میں
دیتے پتا ہیں انڈین اُس کے مزار کا
آبادیوں سے دُور، صنوبر کے سائے میں

(۴)

ہے دوسرا پڑا ہُوا آغوشِ بحر میں
نیچے، جہاں پڑے ہیں گہر جگمگا رہے
وہ ایک ساحری تھا محبّت کے سحر میں
جو پائے قبر اُس کے ہیں آنسو بہا رہے

(۵)

ہے تیسرا جنوب میں مستِ مئے فنا
بیلیں چڑھی ہیں تاک کی خاکِ شہید پر
ہسپانیہ کے معرکۂ جنگ میں گرا
پرچم کو اپنے سینے پہ تھامے رہا مگر

(۶)

چوتھی وہ رشکِ گُل کہ نسیمِ بہار سے
مہندی کے برگ جھڑتے ہیں جس کے مزار پر
مُلکِ اطالیہ میں پڑی زیرِ خاک ہے
تھی جس سے یادِ صحبتِ دیرینہ تازہ تر

(۷)

اِک دوسرے سے دُور ہیں خوابیدہ زیرِ خاک
جو اِک شجر کے سائے میں کھیلا کئے کبھی
کرتے تھے مل کے وقتِ دُعا حمدِ ذاتِ پاک
وابستہ ایک دامنِ مادر سے تھے سبھی

(۸)

تھا گھر میں اُن کے نُورِ تبسّم سے چاندنا
نغموں میں وہ خوشی تھی کہ دیکھی سُنی نہ ہو
کس درجہ یاس خیز ہے اُلفت کی انتہا
اس زندگی کے بعد اگر زندگی نہ ہو!

سبزۂ نَو

ناداں! اپنے تماشا سرِ تو نکال بیٹھا
لیکن تُو بارِ ہستی گردن پہ ڈال بیٹھا
یہ بار وہ ہے جس کو رو رو اُٹھائے گا تُو
یہ خار وہ ہے جس سے دامن چُھڑائے گا تُو
صد کوہِ درد ہو گی اس بوجھ کی گرانی
بارِ گراں ترین ہے دنیا میں زندگانی
اس بوجھ کو اُٹھا کر کتنے ہی دُکھ بھرے گا
یہ بوجھ وہ ہے جس کے نیچے تو دب مریگا
آخر عذابِ ہستی سر سے ترے ٹلے گا
جس وقت کوئی تجھ کو پامال کر چلے گا

ارمانِ دیدِ گُل ہے؟ دھوکا ہُوا ہے تجھ کو

لے کر عدم سے آئی تیری قضا ہے تجھ کو

رُخ پر ترے پسینہ گرمیٔ شوق کا ہے

اے سبزہ! جس کو شبنم لوگوں نے کہہ دیا ہے

محرومِ نار تجھ سے رہ رہ کے کہہ رہا ہے

نو واردِ گلستاں! دھوکا تجھے ہُوا ہے

ہے خندۂ گل نہ برقِ فنا کا جلوہ

آیا نظر جو تجھ کو غافل! بقا کا جلوہ

حیرت کو تیری ہونگے یاں انقلاب لاکھوں

ہستی کی رات میں تو دیکھے گا خواب لاکھوں

نازک اداؤں سے تیرا یہ لہلہانا

مستانہ لغزشوں سے یہ لوٹ لوٹ جانا

ٹوٹے ہے تُو زمیں پر پی کر شرابِ اُلفت
مستی شکن ملے گا لیکن جوابِ اُلفت
پڑ جائے گا چمن کا جس وقت رنگ پھیکا
مجھ کو تو فکر ہے یہ کیا حال ہو کسی کا
نہروں سے جب روانی کر جائے گی کنارا
ڈوبیں گے بحرِ غم میں صد برگ اور ہزارا
ہو جائے گا فضا سے ابرِ بہار رُخصت
بادِ خزاں چلے گی، برسا کرے گی حسرت
آکر قضا ہنسے گی جب گُل کی جا چمن میں
اے سبزہ! خاک اُڑے گی بُلبُل کی جا چمن میں
ہر اک کا مدّعا ہے دنیا میں شادمانی
تیری طرح ہے عالم جو پائے کامرانی

گلہائے لطفِ دُنیا ہرچند چیدنی ہیں

نظّارہ ہائے عالم دل کش ہیں، دیدنی ہیں

لیکن غضب تو یہ ہے ان میں بقا نہیں ہے

افسوس! دل لگی کا کچھ بھی مزا نہیں ہے

ننّھا سا تُو کسی کا اک نخلِ آرزو ہے

پھلنے کی آرزو پر آیا کنارِ جُو ہے

لیکن ترا یہ سودا سودائے خام ہوگا

پھلنے سے پہلے تیرا قصّہ تمام ہوگا

جس خاک سے اُگا ہے اُس خاک میں ملے گا!

گُل تیری آرزو کا اگلے برس کھلے گا!

ایّامِ غم

(ترجمہ از انگریزی)

سرد ہے دن، تیرہ و تاریک ہے اور خوفناک

مینہ برستا ہے، ہوائے تیز ہے گرمِ سفر

اب تلک لپٹی ہوئی دیوار سے لپٹا ہے تاک

جھونکے جھونکے سے ہیں گرتے خشک پتّے خاک پر

اور دن ہے تیرہ و تاریک و سرد و خوفناک!

زندگی میری بھی ہے تاریک و سرد و خوفناک

بارشِ اشک رواں ہے، صرصرِ آہِ سحر

عہدِ ماضی سے مرے جذبات ہیں لپٹے ہوئے

اور جوانی کی اُمنگیں گِر رہی ہیں خاک پر

آہ! یہ ایّام ہیں تاریک و سرد و خوفناک!

صبر، ہاں صبر اے دلِ مغموم، بے جا شکوہ ہے

ابر کے پیچھے ابھی تاباں ہے مہرِ تابناک

ساری دنیا کی یہی قسمت ہے، کیسا شکوہ ہے

زندگی ہر شخص کی رکھتی ہے باں بیمِ ہلاک

سب کے کچھ ایّام ہیں تاریک و سرد و خوفناک!
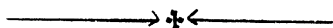
شمعِ سحر

محفل کا رنگ اُڑنے لگا، شب بسر ہوئی

بزمِ نجوم چرخ پہ زیر و زبر ہوئی

آخر حیاتِ شمع چراغِ سحر ہوئی
مُنہ فق ہے، رنگ زرد ہے، حالت بتر ہوئی
کرتا جہاں سے کوچ ہے گویا حسیں کوئی
بیمار لے رہا ہے دمِ واپسیں کوئی
چہرے پہ مُردنی ہے کہاں ہے بہارِ حُسن
مثلِ بقائے گُل نہیں کچھ اعتبارِ حُسن
چمکا کبھی جہاں میں نہ بجھ کر شرارِ حُسن
افسُردگیِ شمع ہے انجامِ کارِ حُسن
مانندِ عشق حُسن بھی حسرت مآل ہے
شمعِ سحر کو دیکھ لو، روشن مثال ہے
گزری شبِ عروج، یہ صبحِ زوال ہے
تھا رات کو جو بدر، وہی اب ہلال ہے

سیلاب تا کمر ہے، یہ اشکوں کا حال ہے
دھونا مگر نوشتِ جبیں کا محال ہے
بیتاب ہو رہی ہے اکیلی کھڑی ہوئی
قسمت کو رو رہی ہے اکیلی کھڑی ہوئی

آنکھوں میں رنگِ محفلِ سوز و گداز ہے
دل کو جلاتی یادِ شبِ سوز و ساز ہے
کہتی ہے دل میں رہنے دو جو دل کا راز ہے
یعنی فسانۂ غمِ ہستی دراز ہے
سر پر اجل ہے، فرصتِ گفتار کس کو ہے
جاں پر بنی ہے طاقتِ گفتار کس کو ہے

حسرت برس رہی ہے رُخِ رشکِ ماہ پر
حیرت نثار ہوتی ہے اِک اِک نگاہ پر

بجلی گرائی صبح کی اِک بے گناہ پر
ہے داغِ تازہ دامنِ چرخِ سیاہ پر
تاراج ہوگیا چمنِ حسن و عشق حیف!
برہم ہوئی وہ انجمنِ حسن و عشق حیف!
نخلِ مرادِ شمع جو شب گل فشاں رہا
محفل میں جوشِ خندۂ گل کا سماں رہا
جب تک زبانِ شمع میں لطفِ بیاں رہا
باغِ چمن میں خشک دمِ طائراں رہا
اب ہے وفورِ نور، نہ جلوہ نمائیاں
بے طرح منہ پہ چھٹنے لگی ہیں ہوائیاں
پروانے جن کی خاک سے ظاہر ہے شانِ عشق
مضطر تھے آہ! کب سے پئے امتحانِ عشق

گر شوق ہو تو کیجئے سیرِ جہانِ عشق

کیا کیا ہیں بے مزار و کفن کشتگانِ عشق!

بڑھ کر ہے اگنی بان سے بھی عشق کا خدنگ

کشتوں کے پشتے لگ گئے بے تیر و بے تفنگ

اے شمع! تیری رونقِ بازار کیا ہوئی

گرمیِ ذوق و شوقِ خریدار کیا ہوئی

وہ آب و تابِ جلوۂ رخسار کیا ہوئی

وہ شب کدھر؟ وہ بزمِ پُر انوار کیا ہوئی؟

کیا ہو گئے وہ ناز، وہ انداز کیا ہوئے؟

وہ ننھے ننھے عاشقِ جاں باز کیا ہوئے؟

شب بھر غریب تختۂ مشقِ ستم رہے

لیکن امیدوارِ نگاہِ کرم رہے

مر کر بھی راہِ عشق میں ثابت قدم رہے

جل کر گرے تو یار کے پاؤں پہ تھم رہے

ہیں مہربانیاں فلکِ دوں نواز کی!

یوں منتشر ہو خاک شہیدانِ ناز کی!

یکسر فغاں طیورِ سحر کی نوازنی

نغمے تمام نالے ہیں ہنگامِ جاں کنی

بگڑا تمام کھیل، نہایت بُری بنی

دل میں ہجومِ یاس ہے صورت پہ مُردنی

دامانِ شوق کھول کے گلگیر رہ گیا

صُورت یہ دیکھ صورت تصویر رہ گیا

کشتیٔ عمرِ شمع پہ آفت بپا ہوئی

بادِ نسیمِ صبح مخالف ہوا ہوئی

بے چاری جلد نذرِ محیطِ فنا ہوئی
اِک شب کی زندگی جو ہوئی بھی تو کیا ہوئی
محروم حالِ شمع سحر غیر ہو گیا
ہوتے ہی صبح خاتمہ بالخیر ہو گیا!

فریادِ یتیم

زباں پر ماجرائے دردِ دل لائیں تو کیا لائیں
ہم اپنے سوزِ غم سے کس لئے اوروں کو تڑپائیں
جو دنیا شاد بستی ہے، بسے روزِ قیامت تک
ہم اپنے شور و شیون سے قیامت کس لئے ڈھائیں

دکھائیں کیوں امیروں کو ہم اپنے فاقہ کش چہرے
کسی کی عیش و عشرت میں بھلا ہم کیوں خلل لائیں
کسی کے رنگ میں کیوں بھنگ ڈالیں اپنے نالوں سے
بلا سے زیست کے دن فاقہ مستی میں گزر جائیں
جگہ تھوڑی سی دیدے اے زمیں! تو اپنے دامن میں
کسی کو تا کہ ہم داغِ تنِ عُریاں نہ دکھلائیں
نکل دل سے نہ یُوں اے آہِ سوزاں بے تحاشا بس
کسی کے باغ میں کلیاں مسرت کی نہ کُمھلائیں
یہ سب کچھ ہے بجا، لیکن بسر ہو زندگی کیوں کر؟
اگر پہنیں تو کیا پہنیں، اگر کھائیں تو کیا کھائیں؟

کرم اے کاش! ہم پہ بے طلب اہلِ کرم کرتے
حیا آتی ہے ہم کو اس طرح اظہارِ غم کرتے

کسی کی چشمِ حیراں کے رہے نورِ نظر ہم بھی
کسی خستہ جگر کے آہ! تھے لختِ جگر ہم بھی

ریاضِ دہر میں حاصل ہوئے ہم بھی ریاضت سے
ہوئے آخر کسی کی شاخِ ارماں کے ثمر ہم بھی

گہن قسمت میں تھا اپنی، وگرنہ نور برساتے
کسی کے مطلعِ امید پر مثلِ قمر، ہم بھی

بھٹکتے پھرتے ہیں بے خانماں اب دشتِ دنیا میں
کسی کے گھر میں تھے رونق فزائے بام و در ہم بھی

مقدر میں تھا تاراجِ خزاں ہونا یونہی، ورنہ
شگفتہ آج ہوتے صورتِ گُل ہائے تر ہم بھی

بنا دی آج گردِ بے کسی نے اور ہی صورت
کبھی تھے آہ! آب و تاب میں مثلِ گُہر ہم بھی

جو ناز اپنے اُٹھاتے تھے، اُٹھے ناکام دُنیا سے
اُنہیں کے ساتھ کرتے کاش! سامانِ سفر ہم بھی

نظر آتا نہیں دُنیا میں جُز ذاتِ خدا کوئی
سُنے کیا اپنے دردِ بیکسی کا ماجرا کوئی!

رکھے گی آہ! قسمت کب تلک بے آب و ناں ہم کو
گزارہ کرنا ہوگا کھا کے کب تک جھڑکیاں ہم کو
جگہ دیتا ہے باغِ دہر پھولوں میں نہ کانٹوں میں
اُڑا لے چل تو اپنے ساتھ اے برگِ خزاں ہم کو
کیا دے دے کے فاقے نیم جاں ہم کو مقدّر نے
نہ تابِ لب کشائی ہے نہ یارائے فغاں ہم کو
خدا وہ دن دکھائے جب نظر ہم اُس کو آجائیں
سُنا ہے، ڈھونڈتی پھرتی ہے مرگِ ناگہاں ہم کو

مجسّم نامرادی ہیں دکھائیں کس کو صورت ہم

چھپالے اے زمیں ہم کو، مٹا دے آسماں ہم کو

ہمارے واسطے باقی نہیں کُنج قفس بھی کیا ؟

نہیں صحن گلستاں کی ہوس اے باغباں ہم کو

وہ لاغر ہیں کہ احساں موت کا بھی اُٹھ نہیں سکتا

عدم کی سمت کوئی بے اجل کر دے رواں ہم کو

رہیں تجھ بن جنھیں دینی ہے تو آرام اے دُنیا!

یتیموں بے نواؤں کا یہاں کیا کام اے دُنیا!

لکھی تھی خانہ ویرانی، پریشانی مقدّر میں

گھروندے جو بناتے تھے بگڑ جاتے تھے خود گھر میں

ابھی سے خانماں برباد طفلی کا رونا ہے

پڑی ہے عُمر اُور باقی نہیں کچھ دیدۂ تر میں

مدارِ زندگی اللہ والوں کے کرم پر ہے
الٰہی اور بھر دے مہر قلبِ مہر پرور میں
ہماری یاد بھی دل میں رہے او نیک دل منعم!
تُو اپنے بال بچّوں میں ہو شاداں جس گھڑی گھر میں
ہماری بے کسانہ سردیوں کا بھی خیال آئے
تُو محوِ استراحت جب ہو نرم و گرم بستر میں
ہماری شامِ تنہائی کا منظر بھی نظر میں ہو
ترا بچّہ ہو محوِ خواب جب آغوشِ مادر میں
تری چشمِ تصوّر میں تنِ عُریاں ہمارا ہو
کرے تو جب کبھی پوشاکِ نو آراستہ بر میں
یہ پیش و پس ہے کیا داتا! دُعائیں لے اناتھوں کی
روپے پیسے کو دانا جانتے ہیں مَیل ہاتھوں کی!

شکوۂ صیّاد

موسمِ گُل میں جو رہ رہ کے چمن یاد آئے
ہمنوا! لب پہ نہ کیوں شکوۂ صیّاد آئے
پھر سوئے کُنجِ قفس نگہتِ برباد آئے
آئے پھر بُوئے غبارِ دلِ ناشاد آئے

آتشِ حسرتِ گلگشت سوا ہوتی ہے
اُجڑے گلشن کی بھی کیا خوب ہوا ہوتی ہے!

یادِ ایّامِ بہاراں کہ چمن تھا، ہم تھے
باغباں بر سرِ کیں ہم سے نہ تھا، بے غم تھے
رُونما شام و سحر عیش و طرب پیہم تھے
اپنے جلسے بھی کبھی غیرتِ جشنِ جم تھے

مستِ صہبائے مسرّت تھے کہ آزاد تھے ہم
اُڑتے پھرتے تھے ہر اک سمت کہ دلشاد تھے ہم!

تھا کمیں میں مگر اے وائے مقدّر! صیّاد
دشمنِ دہر، جفا پیشہ، ستمگر صیّاد
آ گیا دامِ بلا دوش پہ لے کر صیّاد
ہو گیا بہرِ چمن فتنۂ محشر صیّاد

نغمۂ بلبلِ شیدا سے فقط لاگ نہ تھی
کون سا برگ وہ تھا جس کے لئے آگ نہ تھی

خلشِ خار جنہیں زیست سے کر دیتی تنگ
اُن پہ خالی کئے سفّاک نے بھر بھر کے تفنگ
آزما ڈالے ہزاروں ستم و جَور کے ڈھنگ
جاں ستانی میں تامّل، نہ توقّف، نہ درنگ

موت سے بچ کے جو اندوہِ قفس سہتے ہیں
اب وہ یوں نالہ کشِ جور وجفا رہتے ہیں

"بدلے تُو نے یہ لئے ہم سے بھلا کس دن کے
ذبح کر ڈالے ہیں مرغانِ چمن گن گن کے
آشیانوں کے اُڑائے ہیں ستمگر! تنکے
اب تری قیدِ مصیبت میں مکیں ہیں جن کے

بے خطاؤں پہ یہ غصّہ، یہ عتاب اے ظالم!
کبھی دینا ہے خدا کو بھی جواب اے ظالم!

سرو و شمشاد کو بے مہر! اکھاڑا تُو نے
زیرِ گل دامنِ گلزار سے جھاڑا تُو نے
سبزہ بیگانہ تھا، اُس کو بھی لتاڑا تُو نے
نقشۂ حُسنِ چمن آہ! بگاڑا تُو نے

دل ترے سینے میں تھا پاسِ وفا سے خالی!
ترے جذبات تھے احساسِ وفا سے خالی!

جل اُٹھا پھول سے کیوں؟ داغِ تپاں تھا کوئی؟
خار کھٹکا تری نظروں میں، سناں تھا کوئی؟
کج ہوا سرد سے کیوں؟ غیر جہاں تھا کوئی؟
لپکا سائے پہ عبث، اُس میں نہاں تھا کوئی؟
خفقاں تھا یہ ترا جس نے ڈرایا تجھ کو
سایۂ شاخِ گُل افعی نظر آیا تجھ کو!

ہائے وہ صحنِ چمن، صحبتِ یارانِ چمن
شاہدِ بزمِ طرب وہ گلِ خندانِ چمن
اور وہ لالہ کہ تھا شمعِ شبستانِ چمن
ہو گیا داغِ دلِ خانہ ویرانِ چمن

تا سحَر گاتے تھے جس باغ میں گانے والے
اب اُٹھا کرتے ہیں راتوں کو وُہیں سے نالے!

حُکم تیرا ہے کہ فریاد نہ ہونے پائے
کوئی بلبل کہیں آزاد نہ ہونے پائے
دہر میں شہرتِ بیداد نہ ہونے پائے
اور مشہور یہ رُوداد نہ ہونے پائے

"نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے
گھُٹ کے مر جاؤں یہ مرضی مرے صیّاد کی ہے"!

بُلبُل کی فریاد

صیّاد نے چھُڑایا جس دن سے آشیانا
پہلو میں دل کے بدلے غم نے کیا ٹھکانا

گلزار سے نکالا، قیدِ قفس میں ڈالا
بے درد کچھ نہ سمجھا، ظالم نے کچھ نہ جانا

آزاد تھا کبھی میں، دلشاد تھا کبھی میں
تھے وہ بھی دن الٰہی! تھا وہ بھی اِک زمانہ

روتا ہوں خوں کے آنسو آتا ہے یاد جس دم
غنچوں کا مُسکرانا، پھُولوں کا کھِلکھِلانا

موجِ صبا کا چلنا تھم تھم روِش روِش پر

شاخوں کا جھوم جانا، سبزے کا لہلہانا

وہ جاں فزا ہوائیں وہ دل کشا گھٹائیں

مرغانِ ہم نوا کا ساون کے گیت گانا

بارش کی وہ پھواریں، برسات کی بہاریں

پتلی سی ٹہنیوں پر وہ جھولنا جھلانا

صحنِ چمن میں پھرنا وہ شب کو چاندنی میں

دل میں سرور آنا، آنکھوں میں نور آنا

وہ شام کے نظارے جگنو وہ پیارے پیارے

وہ صبح کے ستارے، اُن کا وہ جھلملانا

اِس قیدِ بے کسی کا کب نِنھا خیال مجھ کو

مل جائیں کاش! واپس وہ ماہ و سال مجھ کو

بے رحم کے ستم کی کڑیاں اُٹھا رہا ہوں

بیداد سہ رہا ہوں، دُکھ درد پا رہا ہوں

مجھ بے زباں کی بولی کوئی نہیں سمجھتا

ہر چند چیخ کر مَیں دُکھڑا سُنا رہا ہوں

قسمت کو رو رہا ہوں مَیں، اور یہ ستم گر

دل میں سمجھ رہا ہے، خوش ہو کے گا رہا ہوں

اِک آگ سی لگی ہے یادِ وطن کی دل میں

رو رو کے آنسوؤں سے اُس کو بجھا رہا ہوں

سب ہمصفیر میرے خوشیاں منا رہے ہیں

تن تن کے اُڑ رہے ہیں اُڑ اُڑ کے گا رہے ہیں

میرا نصیب مجھ سے گر سازگار ہوتا

مَیں بھی ترانہ سنجِ فصلِ بہار ہوتا!

پھولوں کی انجمن سے ہوتی اگر نہ دُوری
یہ دل مرا نہ ہرگز یوں داغدار ہوتا
شبنم کے وہ نظارے نظروں سے گر نہ چُھپتے
کیوں زار زار روتا؟ کیوں اشکبار ہوتا؟
اس قید سے رہائی ممکن اگر نہیں ہے
میرا بھی کچھ تو چارہ پروردگار ہوتا
شاخِ نہال پر یا پنجرا مرا لٹکتا
پنجرے میں یا ہجومِ سرو و چنار ہوتا
پنجرے کا آب و دانہ یارب! ہے زہر مجھ کو
کھانا عذابِ جاں ہے پینا ہے قہر مجھ کو
اے کاش! جا کے بیٹھوں پھر کنجِ دلنشیں میں
گاتا پھروں ترانے گلشن کی سرزمیں میں

سوزِ نہاں بُجھاؤں جُوئے چمن پہ جا کر

پھر جا ملوں میں اپنے یارانِ دانہ چیں میں

یہ تیلیاں قفس کی، اے کاش! پھونک ڈالوں

اتنا اثر تو یارب! ہو آہِ آتشیں میں

اُجڑا ہُوا نشیمن پھر جا بساؤں اپنا

اب کے جو تھا بنایا گلہائے یاسمیں میں

کب ہو مجھے رہائی، کب آشیاں میں پہنچوں

اپنے وطن کو جاؤں، اپنے مکاں میں پہنچوں!

→•←

چڑیا کی زاری

اے بدنہاد لڑکے ! اے نابکار لڑکے !
یہ کیا کیا ؟ خدا کی تجھ پر ہو مار لڑکے !
نازل غضب خدا کا تجھ پر اسی گھڑی ہو
اور موت لے کے خنجر سر پر ترے کھڑی ہو
ظالم ! خدا کرے تو بچپن میں جان کھوئے
میری طرح سے تیری ماں زار زار روئے
بے رحم ! کیا بگاڑا ان بے پروں نے تیرا
نقصان کیا کیا تھا اِن بے گھروں نے تیرا

موجِ فنا میں ان کو تُو نے بہا دیا کیوں ؟

ان کا نشانِ ہستی ظالم! مٹا دیا کیوں ؟

اب تک نہ تھے اُنھوں نے سفّاک! پر سنبھالے

میرے غریب بے پر! میرے وہ بھولے بھالے

کِن کِن مصیبتوں سے تھا آشیاں بنایا

لالا کے تِنکا تِنکا تھا گھر یہاں بنایا

وہ گھر کہیں پڑا ہے بچّے کہیں پڑے ہیں

دُور از مکان ویراں بیکس مکیں پڑے ہیں

وہ میرے پیارے بچّے! لختِ جگر وہ میرے

چشم و چراغ میرے! نورِ بصر وہ میرے!

وہ میرا گھر میں آنا، اُن کا وہ چہچہانا!

اُن کا وہ لاڈ کرنا! میرا وہ صدقے جانا!

کن کن دُکھوں سے ہائے بچّوں کو مَیں نے پالا
پڑنا تھا وائے قسمت! اس پُرجفا سے پالا

مٹّی پہ ہائے ہائے بیجان پڑے ہوئے ہیں
کس نیند میں یہ میرے ناداں پڑے ہوئے ہیں؟

اے میرے پیارے بچّو! امّاں تمہاری آئی
چُن چُن کے دانہ خاطر تمہاری آئی

مَیں نے سحر سے تم کو پانی نہیں پلایا
اُٹّھو کہ اب تمہارے اُٹھنے کا وقت آیا!

خاموش کیوں پڑے ہو منقار جلد کھولو!
کیوں رُوٹھتے ہو مجھ سے! ہاں کچھ تو منہ سے بولو!

افسوس، نسلِ انساں تجھ میں وفا نہیں ہے
کہتے ہیں اُنس جس کو، تجھ میں ذرا نہیں ہے

نالاں رہے ہیں تجھ سے مہر و وفا ہمیشہ
باہر نیام سے ہے تیغ جفا ہمیشہ
ہمسائگی میں تیری آکر ہوئے مکیں تھے
لچھّن ترے مگر ہم کچھ جانتے نہیں تھے
سختی تری ستمگر! کتنی ہے بے کسوں پر
یہ جبر بے تحاشا! یہ جَور بے بسوں پر
غدّار! بے وفائی تیری سرشت میں ہے
تیرا بھی ورثہ دنیائے زشت میں ہے
تجھ میں کہاں محبت، جس کا ہے تجھ کو دعویٰ
تجھ میں کہاں صداقت جس پر ہے نازِ بیجا
نزدیک نسلِ انساں ہرگز کوئی نہ آئے
اپنے جگر پہ زخمِ تیغِ ستم نہ کھائے

اس میل جول کا گر انجام جانتی میں
کم بخت دل کا کہنا ہرگز نہ مانتی میں
جنگل میں جا کے اپنا میں آشیاں بناتی
شاخِ شجر پہ خس کا چھوٹا مکاں بناتی
رہتی ہنسی خوشی سے، بچّوں کو پالتی میں
خطرے میں اپنی جاں کو ہرگز نہ ڈالتی میں
میں اُن کو لا کھلاتی جنگل سے جا کے دانے
جب تک نہیں ہوئے تھے کمسن میرے سیانے
مجھ پر ستم ہوا ہے اے جسم و جاں کے مالک!
اے دادگر زمیں کے، اے آسماں کے مالک!
میں بے زباں ہوں کرتی فریاد تیرے آگے
کہتی ہوں اپنے غم کی روداد تیرے آگے

اب کس طرف کو جاؤں میں بے زبان چڑیا!
میں غم کی ماری چڑیا! میں خستہ جان چڑیا!

مچھلی کی بیتابی

میری خطا جو تجھ سے کروں التجائے رحم
ظالم! تُو وہ نہیں کہ تجھے مجھ پہ آئے رحم
تھے لوگ رحم دل کبھی، وہ بھی زمانہ تھا
اُٹھ ہی گیا ہے اب تو زمانے سے ہائے رحم
دل میں ہے تیرے جور و جفا مہر کے عوض
آنکھوں میں تیری قہر ہے ظالم بجائے رحم

ہے دام تیرے دوش پہ اور ہاتھ میں چھُری

صورت یہ ہو تو کس طرح نزدیک آئے رحم

سینے میں دل کہاں ہے ترے لختِ سنگ ہے

ناواقفِ کرم ہے تُو، ناآشنائے رحم

تڑپا نہ اب مجھے، مرا قصّہ تمام کر

قدرت نے اختیار دیا، قتلِ عام کر!

مسرور ہو نہ دیکھ کے بیتابیاں مِری

سرپنجۂ عذاب میں ظالم! ہے جاں مِری

اے بدگماں نہ رکھ مجھے اُلجھا کے دام میں

مَیں نیمجاں ہوں اب وہ تڑپ ہے کہاں مری

مَیں رہنے والی آہ! تھی دُنیائے آب کی

جلتی ہیں گرمِ ریت پہ اب پسلیاں مِری

کیوں کر سناؤں حالِ دلِ بے قرار کا
تابِ فغاں مجھے ہے، نہ گویا زباں مری
ہو دل میں درد اور سُنے گوشِ دل سے تُو
صد محشرِ فغاں ہیں یہ خاموشیاں مری
تقدیر نے اجازتِ فریاد ہی نہ دی
مجھ کو زبانِ شکوۂ بیداد ہی نہ دی!
گہوارہ مجھ سے چھُوٹ گیا موجِ آب کا
باعث نہ مجھ سے پوچھ مرے اضطراب کا
وہ نرم نرم کائی! وہ مخمل کا فرشِ سبز
چھوٹا سا آہ! خیمۂ آبی حباب کا
خشکی پہ آکے آہ! جھُلستا ہے تن مرا
پیشِ نظر ہے چار سُو عالم سراب کا

ڈالا مجھے بہشت سے دوزخ میں یک بیک

اے آسماں سبب کوئی اِس انقلاب کا؟

آبِ رواں نہ رو، مری تقدیر تھی یہی

گرداب غم نہ کر تُو مرے پیچ و تاب کا

روتے ہیں میرے غم میں رفیقانِ زیرِ آب

بزمِ عزا ہے آہ شبستانِ زیرِ آب!

حیرت میں ہوں نہنگِ قضا ہے کہ آدمی!

جان دار پر ہیں دانت، بلا ہے کہ آدمی؟

پیچھا کیا مرا ملک الموت کی طرح

پیغامِ مرگ مجھ کو ملا ہے کہ آدمی؟

شفقت بھری یہ شکل، یہ کرتوت ہائے ہائے

ہنگامۂ خموشِ جفا ہے کہ آدمی؟

اے تُف! چھری بغل میں ہے اور مُنہ میں رام رام
مجموعۂ فریب و ریا ہے کہ آدمی؟

جانیں قدم قدم پہ مُسلتا ہے زیرِ پا
یارب یہ کوئی فتنہ اُٹھا ہے کہ آدمی؟

سو سو شرارتیں ہیں جہاں پر بشر ہے ایک
عنقا ہے خیر، جزوِ بشر آج شر ہے ایک

مخلوق ہم بھی ہیں اُسی پروردگار کی
جس کے کرم پہ ہے نظر امّید وار کی

انصاف پر اسی کے بھروسا ہمیں بھی ہے
میزاں ہے جس کے ہاتھ میں روزِ شمار کی

کب تک بھلا چھپائینگی خُون بے گناہ کا
نیرنگیاں یہ گردشِ لیل و نہار کی

دکھلاؤں گی وہاں دلِ بریاں کا داغ داغ
مجھ کو قسم ہے اپنے تنِ داغ دار کی

ہے شکر کی جگہ کہ وہ دن بھی قریب ہے
شاکی بہت ہوں میں ستمِ روزگار کی

کیا جو ترا خدا ہے وہ میرا خدا نہیں!
فریاد رس وہ "ماہیٔ بے آب" کا نہیں؟

رہٹ خود بھاری ہے، پھر اس پہ یہ پتّھر کیسا؟
جور پر جور، جفا کیش، ستم گر! کیسا؟

پٹّی آنکھوں پر مری ، دیکھنے والو کیسی ؟
ہائے اے گردشِ تقدیر! یہ چکّر کیسا ؟
کس خطا پر یہ ملاتا ہے ہمیں مٹّی میں
آسماں ہم سے ہُوا آہ ! مکدّر کیسا ؟
بدلے کس دن کے لئے بیل بنا کر ہم کو
اس کو مل جائے گا کیا اتنا ستا کر ہم کو

ختم ہونے نہیں پاتا وہ سفر ہے اپنا
ہم چلے جاتے ہیں دن رات، جگر ہے اپنا
کاش! اسی راہ میں آپڑتا عدم کا رستہ
اُلٹا افسوس! نصیبا ہی مگر ہے اپنا
ہم جہاں ٹھہرے ذرا ، پیٹھ پہ کوڑا سا پڑا
دم کہاں لیتے ہیں، اس میں بھی ضرر ہے اپنا

تیل ٹپکے ہے پڑا کولھو سے قطرہ قطرہ!
خشک ہوتا ہے ادھر لوہو سے قطرہ قطرہ!

مرغزاروں میں نہ جا کر کبھی سبزہ دیکھا
بہتے دریا کا نہ سر سبز کنارا دیکھا
اپنے ہمجنسوں سے جا کر نہ ملے دم بھر کو
کھیل دیکھی نہ کبھی، کوئی تماشا دیکھا
چار دیواری یہی تیلی کے گھر کی دیکھی
اور اس قیدِ دوامی میں بھلا کیا دیکھا

بیل کولھو کا بنائے گئے تقدیر سے ہم
نکلے گردش سے نہ ہرگز کسی تدبیر سے ہم!

تن بہ تقدیر، یہی کام کئے جاتے ہیں
منتظر موت کے مر مر کے جئے جاتے ہیں

لختِ دل کھانے کو ملتا ہے سو کھا لیتے ہیں
خون جب تک کہ جگر میں ہے، پئے جاتے ہیں

داورِ روزِ قیامت کے لئے ہم دل پر
داغ بے مہریِ انساں کے لئے جاتے ہیں

کاش! ٹل جائے کہیں سر سے عذابِ ہستی
ہائے! کب تک رہیں ہم زیرِ عتابِ ہستی!

کام لیتے ہیں مگر، کھانے کو کیا دیتے ہیں
کیسی بیدردی سے خدمت کا صلا دیتے ہیں

دشمنِ اہلِ وفا ہیں یہ کدورت والے
خاک میں رنگِ محبّت کو ملا دیتے ہیں

لے کے آجاتے ہیں چھریاں دمِ آخر سر پر
حقِ خدمت کو بہت جلد بھلا دیتے ہیں

کیسے ظالم ہیں، نہ کچھ مُزد نہ منّت! یارب!
کوئی ایسوں کی کرے کس لئے خدمت یارب!

اے اجل! آ کہ ہے اک تیرا سہارا ہم کو
تری آنکھوں سے ہے ڈھارس کا اشارا ہم کو

ہائے تقدیر ہی تھی دشمن جانی اپنی
زندگی دے کے جفا کار نے مارا ہم کو

قیدِ ہستی سے رہائی کا ہو چارا کوئی
اب ہے درکار نہ کچھ گھاس نہ چارا ہم کو

اے خدا! مُلکِ عدم میں نہ ہو کو لھو کوئی
ہم کو مل جائے نہ پھر آہ! جفا جُو کوئی!

یادِ ایّام

یادِ ایّامِ کامرانیٔ دل — درحقیقت ہے نوحہ خوانیٔ دل

دل کہ ہنگامہ زارِ محشر تھا — اب ہے وقفِ سکوتِ حیرت زا

یاد آتا ہے سادہ پن اُس کا — ہائے وہ ذوقِ خود شدن اُس کا

آہ! وہ بیقراریاں اُس کی — اور وہ شعلہ باریاں اُس کی

وہ تپش یہ فسردگی افسوس — وہ خلش اور یہ بےحسی افسوس

شوق کے دن وہ ذوق کی راتیں — اب ہیں عہدِ گزشتہ کی باتیں

اُف! وہ ہنستی ہوئی شبِ مہتاب — وہ جنوں آشنا دلِ بیتاب

مہ و انجم سے ہمکلام کبھی — کشتۂ برقِ اوجِ بام کبھی

جلوۂ شاہدِ سحر ہے ہے! — طالبِ حُسن وہ نظر ہے ہے!

ہائے کتنی حسیں تھی یہ دُنیا
حُسنِ مطلق کا عکس تھی گویا

اس کی وہ دلفریبیاں افسوس
دل کی وہ ناشکیبیاں افسوس!

چھپ گیا حُسن اب نگاہوں سے
ہم ہوئے دُور اس کی راہوں سے

قحط ہے دل لگی کے ساماں کا
زندگی ہے سفر بیاباں کا

جس میں خندہ ان تھے انبساط کے پھول
منظر اس راستے کا اب ہے ملُول

گو وہی کائنات ہے ساری
ہو گئی رنگِ حُسن سے عاری

دلکشی ہے نہ خندۂ گُل میں
نہ اثر ہے نوائے بلبل میں

سبزہ و گل کی وہ ادا نہ رہی
باغِ عالم کی وہ فضا نہ رہی

منظرِ دہر جا بہ جا بدلا
رنگ لیل و نہار کا بدلا

ہے وہی آسماں وہی خورشید
نظر آتی نہیں شعاعِ اُمید

گو وہی چاند اور ستارے ہیں
چشمکیں ہیں نہ وہ اشارے ہیں

لطف باقی نہیں بہاروں میں
نہ ہے برسات کے نظاروں میں

ہے اسی طور اب ہمیں رہنا
پھر غضب یہ کہ شعر بھی کہنا!

کبھی کی یاد

(۱)

بیتابیاں تھیں دن کو اور بے قراریاں تھیں
بیخوابیاں تھیں شب کو اختر شماریاں تھیں
ہر صبح چشمِ تر سے خُوننابہ باریاں تھیں
کیا تھے بہار کے دن کیا لالہ کاریاں تھیں

(۲)

کیا لالہ کاریاں تھیں؛ کیا تھے بہار کے دن
وہ بیکلی کی راتیں؛ وہ انتظار کے دن
وہ اضطراب پیہم وہ خلفشار کے دن
تھے اس سکوں سے بہتر وہ اضطرار کے دن

(۳)

وہ اضطرار کے دن تھے اس سکوں سے بہتر
جب دل رہینِ غم تھا اور جاں بحال ابتر
جب داغہائے دل تھے مانندِ مہرِ انور
پہلو میں جبکہ دل تھا ہنگامہ زارِ محشر

(۴)

ہنگامہ زارِ محشر پہلو میں جبکہ دل تھا
دل آہ! جبکہ وقفِ فریادِ متّصل تھا
ناواقفِ ادائے دُنیائے آب و گِل تھا
فطرت میں وہ تپش تھی جس سے شرر خجل تھا

(۵)

جس سے شرر خجل تھا فطرت میں وہ تپش تھی
ہر آرزوئے مضطر محوِ دوا دوش تھی
کیا عشق میں تپش تھی کیا حُسن میں کشش تھی
لذّت فزائے ہستی پہلو میں اِک خلش تھی

(۶)

اب دل ہے اور نہ دل میں احساسِ زندگی ہے
جو غم ہے بے مزا ہے بے کیف ہر خوشی ہے
اے عہدِ رفتہ تیری کیوں یاد آ رہی ہے
ہاں یاد تیری آخر کیا ہم سے چاہتی ہے
اشکِ رواں؟ گُہر ہیں بے آب کیا کرے گا؟
آہ و فغاں؟ اب اِن کو تاثیر کون دے گا؟

→•←
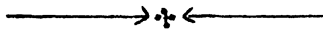
جانبِ مشرق گئی جب صبحدم خالی نظر

واژگوں اِک کاسۂ حسرت فزا تھا آفتاب

دفعتہً مستانہ میں نے اُس پہ اِک ڈالی نظر

جامِ زرّیں میں چھلکتی تھی محبّت کی شراب

آسماں کو مَیں نے دیکھا پھر نگاہِ غور سے

گُنبدِ ویراں نظر آیا وہ نیلے سنگ کا

سر اُٹھا کر مَیں نے دیکھا پھر نرالے طور سے

تھا وہ اِک قصرِ طلسمی لاجوردی رنگ کا

بہ رہا تھا لے کے پانی پست سا اِک رہگذر
تنگیٔ دل کا سبب تھی وسعتِ پہنائے سِندھ
آہِ حسرتناک مَیں نے کھینچ کر دیکھا اُدھر
یک بیک بحرِ محبّت ہوگیا دریائے سِندھ

بسکہ مجھ کو آرزوئے منظرِ زیبا رہی
چھان مارا مَیں نے پھر کر پتّا پتّا باغ کا
جاتے جاتے اتفاقاً اِک نظر ایسی پڑی
عکسِ فردوسِ بریں تھا آہ! نقشہ باغ کا

غنچہ و گل میں ادائے دلبری ایسی نہ تھی
شورِ مہمل عندلیبوں کی تھی ہاؤ ہُو مجھے!

کھل کے جب بوئے محبت میرے اپنے دل نے دی
گُل نظر آیا نگارستانِ رنگ و بو مجھے!

سروِ گُلشن کچھ نہ تھا اک سیدھا سادہ پیڑ تھا
کھُب سکا آنکھوں میں کب پہلو کوئی انداز کا
دیدۂ رقص آفریں کا جبکہ جادو چل گیا
چھا گیا اُس پر وہیں عالم خرامِ ناز کا

ہو گیا خورشید اوجھل آنکھ سے اور سر بسر
گرد سی اُڑتی نظر آئی سوادِ شام میں
ہو گیا محروم لیکن چشمِ اُلفت کھول کر
زلفِ جاناں کا تماشائی سوادِ شام میں

محفل آرائے شبستانِ فلک غائب رہا
گرچہ شمعوں کی طرح روشن ستارے ہو گئے
لیکن انجمؔ سے لڑیں جب پیار کی آنکھیں ذرا
انکشافِ راز کو کیا کیا اشارے ہو گئے!

اِک تماشائے محبت، ہیں تری گلکاریاں
صرف کر دیتی ہے ہر اک چیز میں صنعت نئی
تیری آنکھوں سے نظر جس چیز پر ڈالی یہاں
ہو گیا پیشِ نظر جلوہ نیا، رنگت نئی

بدنما چہروں میں تُو نے حُسن پیدا کر دیا
جلوہ افگن جب ہوئی خال و خطِ انساں میں تُو
دِل کی ٹھنڈک کے لئے صحرا کو دریا کر دیا
رحمتِ باری ہے دُنیائے سفر ساماں میں تُو

موہنی

ابتدائے آفرینش، جلوۂ صبحِ بہار
رُوکشِ گلزارِ جنّت تختہ ہائے مرغزار
جلوۂ حُسنِ ازل کی، آہ! وہ پہلی جھلک
نوعُروسانِ چمن کا، آہ! وہ پہلا سِنگار
پتّہ پتّہ شاخ کا وادیِٔ ایمن دربغل
ذرّہ ذرّہ خاک کا سامانِ طُور اندر کنار
بارشِ حُسنِ سکُوت آمیز کوہ و دشت پر
جیسے ساوؔن میں ہو کُم کُم ابرِ رحمت کی پھوار
حُسنِ فطرت کا تقاضا یوں تماشائی سے ہے
جاں کو کر دیجے فدا، اور دل کو کر دیجے نثار

منظرِ قدرت تو ایسا ہی سُہانا ہے، مگر
کون دیکھے؟ دیکھنے والے ہیں محوِ کارزار
دیوتا دیت ہیں مصروفِ جدل اِک بحر میں
ہیں بلوتے اُس کو اور ہوتا ہے امرت آشکار
کون اب امرت پیئے، یہ فیصلہ آساں نہیں
زندگی اور موت کی سی کشمکش ہے بار بار
ہو کے منصف، دیکھیے، ثالث کہاں سے آئیگا!
کون ہے ایسا زمیں پر، آسماں سے آئیگا!
ہے لبِ بحرِ رواں اِک گلشنِ خاطر نشیں
سبزۂ تر سے زمرّد پوش ہے جس کی زمیں
سایہ افگن لمبی لمبی دوب پر اشجار ہیں
وہ گھنے اشجار جن سے دھوپ چھن سکتی نہیں

اِک تناور پیڑ کی شاخوں میں ہے جھولا پڑا
وا ہے با آغوشِ شوقِ عاشقِ اندوہگیں
اور اس جھولے پہ اک مستِ مئے اندازِ حُسن
ناز پرور، نازنین، نازک بدن، ناز آفریں
برقِ طلعت، ماہ وش، خورشید رُو زہرہ جمال
ہے پرستاں کی پری، یا حُورِ فردوسِ بریں
جھولتی بیٹھی نظر آتی ہے کس انداز سے
ناز سے ڈالے ہوئے ڈوروں پہ دستِ نازنیں
ہے یہ وہ تصویرِ خوبی، یہ وہ نقشِ ناز ہے
غرقِ حیرانی ہو جس کو دیکھ کر ارژنگِ چیں
چاند سا چہرہ اِدھر، اور گیسوئے مُشکیں اُدھر
ابر کے پردے سے نکلا ہے ابھی ماہِ مبیں

شانِ رعنائی عیاں ہر عُضو سے ہر انگ سے

اور پھر سب سے ہویدا اک ادائے شرمگیں

ایک ساڑھی زیب بر ہے جو گلے سے پاؤں تک

جسم گُلگوں سے ہوئی دامانِ گلچیں بالیقیں

ہائے یہ اُٹھتی جوانی اور یہ جوبن کا اُبھار

ایک ساڑھی میں سمائیں دل کو حیرت سے یہیں

موتیا کے ہاتھ میں گجرے ہیں یا موتی کے ہیں

ہم بتائیں، گر نظر جمنے دے حُسنِ آتشیں

بڑھ چلا سبزہ کہ وہ پائے نگاریں چوم لے

بوسۂ دستِ حنائی کے لئے شاخیں جُھکیں

تازیانہ اور رہوتا ہے سمندِ ناز پر

ہیں بکھر جاتے ہوا میں جب کہ موئے عنبریں

اے صبا! کھولے ہوئے آغوشِ حسرت ہے فلک
تھام لے پٹڑی کہ ہو جائے نہ کچھ دھوکا کہیں
موہنی ہے نام اُس کا، کیسا پیارا نام ہے
نام و صورت میں تفاوت نام کو اس جا نہیں
دیکھنے والو! ادب سے دیکھنا اس کو کہ ہے
دونوں عالم کے حسینوں سے نرالا یہ حسیں!
یہ مقدّس نازنیں دیوی ہے حُسنِ پاک کی
ہے بجا! دھوکہ پیئے گر پاؤں اسکے حُورِ عیں
جلوہ گر حُسنِ حقیقی اس کی صورت میں ہُوا
ہیں سبھی خوبانِ عالم جس کی ہستی کے رہیں
موہنی اعجازِ حُسن اپنا دکھانے آئی ہے
یعنی امرت دیوتاؤں کو پلانے آئی ہے!

مدرسہ کی یاد

یاد آیا میکدہ! خوش طفلِ دلِ بے چارہ تھا
میری اُمّیدوں کا تُو اے مدرسہ! گہوارہ تھا
آہ! جب مَیں وقفِ حسرت ہائے گوناں گوں نہ تھا
آہ! جب مَیں واقفِ نیرنگیٔ گردوں نہ تھا
میری نظروں میں تھی جب دُنیا مسرّت کا مقام
ہاں یہی دُنیا جو اَب ہے لاکھ عبرت کا مقام
تجھ سے تھا وابستہ میرا روزگارِ خرّمی
آہ جب ہر صبح تھی صبحِ بہارِ خرّمی

عافیت کا کنج تھا تو امن کا گھر تھا مجھے
تیرا دامن صورتِ آغوشِ مادر تھا مجھے

عندلیب خوشنوا تھا، دام سے آزاد تھا
بے قرار یہائے صبح و شام سے آزاد تھا
مثلِ بلبل مجھ کو رہتا جلوۂ گُل کا سرور
ہلکا ہلکا اُف وہ صہبائے تخیّل کا سرور
زندگی خود موسمِ گُل تھی، بہار آمیز تھی
انبساط افزا، دلاویز و نشاط انگیز تھی
مجھ سے دُنیا، اور دُنیا کے بکھیڑے دُور تھے
جن میں ہیبت کا اثر ہے وہ نظارے دُور تھے

یوں مرے دل پر مسلّط یاس کا عالم نہ تھا
دل تو تھا پہلو میں، لیکن دل میں کوئی غم نہ تھا

سامنے تھا ہر گھڑی روئے دلارائے اُمید

اب کہاں وہ لذّتِ ذوقِ تماشائے اُمید

آہ! وہ ایامِ دلکش واپس آ سکتے نہیں

اور ہم کھوئی ہوئی خوشبوں کو پا سکتے نہیں

طفلی و عہدِ مسرّت ہائے طفلی اب کہاں

ہم کہاں اور تیرے دیوار و درائے مکتب کہاں

ساتھ کے کھیلے ہوئے وہ آشنایانِ عزیز

یاد جن کی اب بھی ہے فرحت دہِ جانِ عزیز

وہ کہاں، اور ہم کہاں اے گردشِ لیل و نہار

لے گئی بہتی بہاتی آہ! سیلِ روزگار

یاد وہ بھی کرتے ہونگے آہ ان ایام کو

اور بہلاتے یوں ہی ہونگے دلِ ناکام کو

وہ بھی، جن کو تجھ سے اسے مکتب ذرا وحشت رہی
اپنی نافہمی کے باعث تجھ سے کچھ نفرت رہی

وہ بھی، ہاں خود وہ بھی جو سمجھا کئے زنداں تجھے
یاد کرتے ہوں گے اب با دیدۂ گریاں تجھے

کیونکہ دنیا میں میسّر گو انہیں عشرت بھی ہو
اور آزادی بھی ہو، عزّت بھی ہو، شہرت بھی ہو

کس کو مل سکتے ہیں پھر اسے مدرسہ طفلی کے دن
خوابِ نوشیں کی وہ راتیں اور بے فکری کے دن!
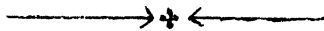
اپنا گھر

دُنیا میں اگر مسکنِ راحت ہے تو گھر ہے
ممکن جو کوئی جائے مسرّت ہے تو گھر ہے
درخورد تمنّائے اقامت ہے تو گھر ہے
اِس دارِ فنا میں کوئی جنّت ہے تو گھر ہے

رہتے ہیں وہ اس کے بصد جوشِ محبّت!
زیبا ہے جو کہئے انہیں آغوشِ محبّت!

گھر کان مسرّت ہے محبّت کے اثر سے
ایوانِ سعادت ہے صداقت کے اثر سے
سرمایۂ دولت ہے قناعت کے اثر سے
ہمپایۂ جنّت ہے یہ راحت کے اثر سے

گھر ساحلِ دریائے حوادث ہے جہاں میں
رہتا ہے یہیں آکے بشر امن و اماں میں!

گو عالمِ گلزار ہو ہر سمت سفر میں
گلگشت کا سودا ہو سمایا ہوا سر میں
کانٹا سا مگر ایک کھٹکتا ہے جگر میں
گھر دل میں جو رہتا ہے تو دل رہتا ہے گھر میں

ضبطِ دلِ ناکام کا چارا نہیں رہتا!
مدّت جو گزر جائے تو یارا نہیں رہتا!

وحشت سے جو گھر میں کبھی کھجلاتے ہیں تلوے
کانٹوں کے لئے گھر سے نکلواتے ہیں تلوے
جب ہوتے ہیں چھلنی تو مزا پاتے ہیں تلوے
پھر خیر سے خود راہ پہ آجاتے ہیں تلوے

دل تنگ کئے دیتی ہے صحراؤں کی وسعت!
خود گھر پہ سکڑتی ہے تمنّاؤں کی وسعت!
تسکیں طلبوں کے لئے گھر دارِ سکوں ہے
رم گھر سے جو کرتا ہے گرفتارِ جنوں ہے
نیرنگِ سفر مثمرِ آزارِ فزوں ہے
آوارگیٔ دشتِ سفر کارِ زبوں ہے
نقشہ سا کھچا رہتا ہے گھر کا جو نظر میں
ہوتا ہے یہی باعثِ آرام سفر میں!
کتنا ہی غریبانہ ہو بیکار نہیں ہے
گھر رفعتِ بام و در و دیوار نہیں ہے
کچّا ہو کہ خس پوش ہو کچھ عار نہیں ہے
پستی سے کوئی گھر کی نگونسار نہیں ہے

ہو قصرِ شہنشاہ کہ درویش کا چھپّر
دونوں ہیں بحیثیتِ کاشانہ برابر!

بستا ہُوا گھر رحمتِ باری کا نشاں ہے
افلاک سے ہر دم برکت جلوہ کُناں ہے
نکہت گُلِ الفت کی وہاں عطر فشاں ہے
ہے گُلشنِ شاداب کہ بے نقصِ خزاں ہے
یا رب رہے آباد زمانے میں گھر ایسا!
ناکام زمانہ ہو مٹانے میں گھر ایسا!
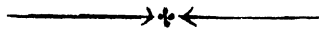
سرورِ قناعت

بے تاج اگرچہ سر ہے میرا جانکاہ نہیں ہے دردِ سر بھی
بے داغ ہے دل بھی اور جگر بھی!

دولت مجھے گو نہیں میسّر محفوظ ہیں جسم و روح میرے
عشرت کے نتائجِ زبُوں سے!

شہرت نہیں گو نصیب مجھ کو حاصل ہے راحتِ یقینی
بے خوفِ گزندِ نکتہ چینی!

ہیں دوست اگرچہ میرے دو ایک دشمن نہیں ایک بھی جہاں میں
کانٹا نہیں میرے گلستاں میں!

گو حاکمِ مقتدر نہیں ہوں پکڑے گا نہ کوئی میرا دامن

محشر میں ہیں اِن شور و شیون

بلمے چوڑے خطاب والے کھاتے پسِ پُشت گالیاں ہیں

گو سامنے اُن کے ڈالیاں ہیں!
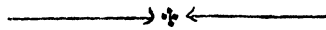
ایک اپنے ساتھ گھر بھر کی خوشی لایا ہے تُو

کس وطن کی یاد میں روتا ہُوا آیا ہے تُو؟

کون سی دُنیائے خنداں یاد آتی ہے تجھے؟

رونے والے! یاد کس کس کی رُلاتی ہے تجھے؟

کیا کوئی زرّیں جزیرہ چھوڑ کر آیا ہے تُو؟

گلشنِ فردوس سے منہ موڑ کر آیا ہے تُو؟

یاد ایسے ہی تو کچھ آتے ہیں نظّارے تجھے
اجنبی سے اس جہاں کے نقش ہیں سارے تجھے
کس لئے حیرت سے یوں ہر اک کا مُنہ تکتا ہے تُو
کچھ تو کہنا چاہتا ہے، کہہ نہیں سکتا ہے تُو!
ہم کو بھی معلوم ہے، تُو ہے مسافر دُور کا
مطلقاً اس دیس کی بولی سے ہے ناآشنا!
ہاں بتا! وہ سرزمینِ عافیت کفی کون سی ؟
بستی ہے دل میں ترے دلخواہ بستی کون سی؟
روشنی ہوتی ہے کیسی چاند سُورج کی وہاں؟
تیرے چہرہ پہ ہویدا ہیں ابھی جس کے نشاں!
کس چمن کا گُل ہے تُو؟ کس عرش کا تارا ہے تُو؟
کس قدر ہے پاک و روشن! کس قدر پیارا ہے تُو؟

آہ! اے نو واردِ ہستی! تجھے معلوم کیا

انقلاباتِ زمانہ ہیں مچاتے ہیں دھوم کیا

آج روتا ہے تو جس دنیا کو زنداں جان کر

کل نہ چھوڑے گا اسی کو باغِ رضواں جان کر!

اس قدر مانوس ہو جائے گا اس دنیا سے تو

پھر وطن کی یاد ہو گی اور نہ اس کی آرزو!

یاد بھولے سے نہ آئے گا تجھے اپنا وطن

تو سمجھ لے گا اسی غربت کو ہی پیارا وطن!

حاصل اک دن بھی نہ ہو گا گرچہ اطمینانِ دل!

پھر بھی دنیا ہی رہے گی شاملِ ارمانِ دل!

بچّے کی مُسکراہٹ

نہ ہجُومِ آرزو ہے　　　نہ وہ حسرتوں کا جمگھٹ
وہ نقوشِ داغِ حرماں　　　ہوئے دل سے محو جھٹ پٹ
کہ اُنہیں مٹا گئی ہے
تری ایک مُسکراہٹ!

تری ایک مُسکراہٹ　　　ہے دوا ہزار اَلَم کی
تجھے دیکھ کر نہ دیکھے　　　دلِ زار شکل غم کی
مرے دل کو بھا گئی ہے
تری ایک مُسکراہٹ!

رُخِ یاس کو چھپا دے　　　اثرِ اُمید جیسے

شبِ تار پر ہو غالب　　سحرِ سعید جیسے

یُونہی دل پہ چھا گئی ہے

تری ایک مُسکراہٹ!

نہ قمر کے نُور میں ہے　　نہ سحر کی روشنی میں

نہ شفق کے رنگ میں ہے　　نہ ہے پھُول کی ہنسی میں

جو سماں دکھا گئی ہے

تری ایک مُسکراہٹ!

ہیں غضب کے خار پنہاں　　گُلِ خندۂ بُتاں میں

نہ نظر اُٹھاؤں اُن پر　　کبھی گلشنِ جہاں میں

کہ پسند آ گئی ہے

تری ایک مُسکراہٹ!

نہ کہے گا کوئی شاعر　　اسے برقِ خرمنِ دل

یہ ہے صُبحِ نو بہاراں بفضائے گُلشنِ دل

گُلِ تر کھلا گئی ہے

تری ایک مُسکراہٹ!

کوئی چشمۂ مسرت ترا دِل ہے طفلِ ناداں!

یہ تبسّم پیاپے ہے برنگِ مَوجِ رقصاں

مجھے خود بتا گئی ہے

تری ایک مُسکراہٹ!

نئی بزم دہر میں ہے ابھی اِنبساط تیری

ہے بہت سرور افزا یہ مئے نشاط تیری

جو مجھے پلا گئی ہے

تری ایک مُسکراہٹ!

تُو گناہ سے بری ہے یہ ہے وجہِ شادمانی

وہ تری صفائے دل ہے کہ ہو آئینہ بھی پانی
یہ مجھے بتا گئی ہے
تری ایک مسکراہٹ!

عجیب و غریب

طالب ہوئے وہ نظمِ عجیب و غریب کے
بکھرے ہوئے حواس ہیں شاعر غریب کے
سکتے میں ہے قلم کہ لکھے بھی تو کیا لکھے
جو واقعی عجیب ہو، وہ ماجرا لکھے
کوئی نہیں یہاں نظر آتی عجیب شے
جو چیز اپنے زیرِ نظر ہے سو کہنہ ہے

روشن بہت کواکب و خورشید و ماہ ہیں
پر وہ بھی پائمالِ سمندِ نگاہ ہیں

دیکھی ہوئی ہے سب کی فضائے چمن بہت
ہے داستانِ بلبل و گل بھی کہن بہت!

ہرگز نہیں حکایتِ مہر و وفا نئی
ہے عشق میں نہ حسن میں کوئی ادا نئی

ہیں حسن کی طرف سے دل آزاریاں وہی
اور آج تک ہیں عشق کی لاچاریاں وہی

کب تازہ بزم و رزم کے منظر دکھاتی ہے
تاریخ اپنے آپ کو دہرائے جاتی ہے

سو بار کی کہی ہوئی باتوں کو کیا کہیں؟
کس بات کو عجیب کہیں یا نیا کہیں؟

ہیں نظمِ کائنات کے مضمون کہن تمام
ہوتا ہے اس خیال سے ذوقِ سخن تمام

ہاں ایک بات ہے جو نہایت عجیب ہے
حیراں اسی پہ یہ دلِ حیرت نصیب ہے

ہیں سب مآلِ ہستیٔ فانی کو جانتے
اور اپنی زندگی کو ہیں دو روزہ مانتے

پھر بھی یہ زورِ حرص و ہوا ہے کہ الاماں
ہنگامہ زا وہ جہدِ بقا ہے کہ الاماں

غالب طلوعِ فکر پہ غفلت کی رات ہے
اس سے عجیب تر بھی کوئی اور بات ہے؟

نیند

راحت افزائے جانِ زار ہے تُو — مرہمِ خاطرِ فگار ہے تُو

نکہتِ صبحِ نوبہار ہے تُو — کہ نہایت ہی خوشگوار ہے تُو

بسکہ دلکش ادا ملی تجھ کو

چشمِ عالم میں جا ملی تجھ کو!

جب پری بن کے شب کو آتی ہے — کیا عجب شعبدے دکھاتی ہے

گو حیا سے بدن چُراتی ہے — سو کرشمے دکھائے جاتی ہے

تیرے ہوتے نگارِ پردہ نشیں!

پردے مژگاں کے مطلق اُٹھتے نہیں

کچھ سکے ہم سے کیا ترا نقشہ — کہ دکھاتی ہے نت نیا نقشہ

سارے نقشوں میں دلرُبا نقشہ   وہ تِرا خوابِ ناز کا نقشہ!

نرگسِ نیم باز کا عالم

خمِ زُلفِ دراز کا عالم!

خوابِ معصوم طفلِ ناداں کا   جلوۂ صاف ماہِ تاباں کا

نام حسرت کا ہے نہ ارماں کا   چہرہ آئینہ رُوحِ فرحاں کا

تُو جو سوتے میں گُدگُداتی ہے

مُسکراہٹ لبوں پہ آتی ہے

کہیں خوابِ گراں کی صُورت میں   اور کہیں شکلِ خوابِ راحت میں

بزمِ عشرت میں، کُنجِ عسرت میں   طرب و عیش میں، مصیبت میں

دل سے ہر ایک کو عزیز ہے تُو

خواب، نوشیں! عجیب چیز ہے تُو

انقلاب

عالم کا ذرّہ ذرّہ ہے دُنیائے انقلاب
ہوتا ہے صُبح و شام تماشائے انقلاب!

فطرت نے باغِ دہر میں کیا کیا کھلائے گُل
غنچوں کے دل میں بھر کے تمنّائے انقلاب

ساحل کو مَوج، مَوج کو ساحل بنا گیا
آیا جو اپنی مَوج پہ دریائے انقلاب

منظر تمام اُس کے تغیّر پذیر ہیں
یہ وادیٔ کہن ہے تہ پائے انقلاب

غم سے ملول دل ہے نہ شاداں خوشی سے ہے
دُنیا مِری نگاہ میں ہے جائے انقلاب

بدلے کبھی ہماری خزاں بھی بہار سے
نیرنگ کوئی ہم کو بھی دکھلائے انقلاب

قائم جو اپنی ذات میں محوِ ثبات ہیں
محروم اُن کو کچھ نہیں پروائے انقلاب
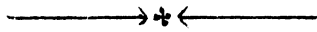
کیا سے کیا

ولیم ورڈزورتھ کے اشعار کا ترجمہ

(۱)

پٹّی پڑی تھی چشمِ حقیقت نگر پہ اور
بے خوف دل مرا تھا فنا کے خیال سے

ایسا ہی تھا طلسم کہ میرا گماں یہ تھا
ہے اُس کا حُسن دُور فنا سے زوال سے

(۲)

زیرِ زمیں ہے بے حرکت اب پڑی ہوئی
وہ باز دید ہے نہ وہ گفت و شنید ہے
چکّر میں ہے زمیں کے ہنڈولے میں رات دن
اک تو وہ گل کا سنگ و شجر پر مزید ہے
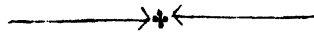
مارِ آستین

تیرا کاٹا بچ نہیں سکتا ہے مارِ آستیں!
کارگر تریاق تیرے زہر پر ہوتا نہیں

اشرف المخلوق میں ہوتا ہے تُو صورت پذیر
کوبرا ہے تُو، نہ چیت کبرا، نہ مارِ یاسمیں
روز و شب رہتی ہی تجھ کو اپنے ہمجنسوں کی تاک
آہ! اے سفّاک، کچھ پاسِ وفا بھی ہو کہیں
تجھ سے اچھے سانپ، گو دشمن ہیں آدم زاد کے
اپنے ہمجنسوں سے لیکن وہ نہیں سرگرمِ کیں
تجھ سے اچھے سانپ، جو دشمن ہیں دشمن کی طرح
زہر کو وہ زہر بتلاتے ہیں، اور تُو انگبیں
تجھ سے اچھے سانپ، جو ڈستے نہیں چھیڑے بغیر
ہاں عدو کو وہ چکھا دیتے ہیں زہرِ آتشیں
تجھ سے اچھے سانپ، جو ہیں واقفِ حُسنِ ازل
مست کر دیتا ہے جن کو جلوۂ ماہِ مبیں

بین کے نغمے سُناتے ہیں جنہیں پیغامِ دوست

خوب لہراتے ہیں سُن سُن کر نوائے دل نشیں

معنیٔ خذ ما صفا کا ہم کو دیتے ہیں سبق

ہو کے محوِ جستجوئے شاخہائے صندلیں

تجھ سے اچھّے سانپ، جن کو از رہِ دلبستگی

موشگافانِ سخن کہتے ہیں زلفِ عنبریں

تُو بھی اِک مارِ گزندہ، وہ بھی مارِ جانستاں

آستیں میں گھر ہے تیرا، دُور وُہ خلوت گزیں

اُن سے بڑھ کر کاٹنے والا سمجھتا ہوں تجھے

مَیں تو سو کالوں کا اک کالا سمجھتا ہوں تجھے!

ہو کے اے ظالم! رہ و رسمِ وفا سے بے نیاز

دستِ جور اپنے ہوا خواہوں پہ کرتا ہے دراز

کھیلتا ہے آہ! جن ہاتھوں پہ اُن کو کاٹ کر

ہاتھ کیا آتا ہے تیرے! اے اسیرِ بندِ آز

تیری باتوں میں تملّق، تیری گھاتوں میں فساد

تُو بباطن دشمنِ جاں، اور بظاہر دلنواز

خم بخم ہیں تیری چالیں مارِ پیچاں کی طرح

ہائے تیرے جوڑ توڑ! اے وائے تیرے سازباز

راستی تجھ میں نہیں ہے کیونکہ تُو اک سانپ ہے

سانپ بھی ایسا کہ ہو پھنکار جس کی جانگداز

کاٹ لیتا ہے اسے اور پھونک دیتا ہے اُسے

دوست دشمن میں نہیں ہے تجھ کو ظالم امتیاز

تیرے پھن میں آہ! اے ظالم غرض کا زہر ہے

تیرے حیلے ہیں بُرے، سَم کی قسم اے حیلہ باز

بیچ ہی ڈالا اُسے بدباطنوں کے ہاتھ حیف!
جس کے قدموں پر ادا کی تھی یوحنا نے نماز

داستانِ چاہِ یوسف جب سے دُنیا میں چھڑی
بھائی کو بھائی کی ہمدردی پہ نازیبا ہے ناز

کون بتلائے کہ سرہنگانِ دارا کون تھے
کھول مارِ آستیں کچھ فتحِ اسکندر کا راز

تُو نہ ہے گیسوئے مشکیں، تُو نہ زُلفِ عنبریں
تیرا سودا ہو جہاں میں کس کو مارِ آستیں!

شاعر اور شاعری

شاعر

شکوہ سنجی آج کرتے ہیں بھری محفل میں ہم
گرچہ ہیں دلدادہ تیرے نام کے، اے شاعری!

جب سنبھالا ہوش تو پایا اسے تیرا اسیر
دل پہ سو پھندے ہیں تیرے دام کے، اے شاعری!

تیری اُلفت نے ہمیں آخر نکمّا کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے، اے شاعری!

تیری نسبت سے ہوئے ناکارہ ہم آوارہ ہم
ہو گئے مورد ہر ایک الزام کے لے شاعری!

تُو اگر مقبولِ دوراں ہے تو پھر ہوتے ہیں کیوں
وار ہم پر گردشِ ایام کے، اے شاعری!

کس لئے رکھتا ہے یوں ہم کو زمانہ تلخ کام
ہم نہ طالب نغمہ کے، نے جام کے، اے شاعری!

ہو گئے کافی ہماری بے خودی کے واسطے
صبح کے جلوے نظارے شام کے، اے شاعری!

پختہ کارانِ جہاں کا کعبۂ مقصد ہے اور
ہم پجاری ہیں خیالِ خام کے، اے شاعری!

اے فدائے روئے رنگینت دلِ حیرانِ ما
شعلۂ مضطر چرا انداختی در جانِ ما؟

شاعری

مَیں جواب اس کا تجھے دیتی ہُوں سُن اے شکوہ سنج!
آنکھ سے تیری ابھی پردہ اُٹھا دیتی ہُوں مَیں
جو نگاہِ جستجو کی منزلِ مقصود ہے
وہ جہانِ حُسن شاعر کو دکھا دیتی ہُوں مَیں
آئنے اس خاکداں میں صاف رہ سکتے نہیں
دل اگر کوئی مکدر ہو، جِلا دیتی ہُوں مَیں
کُفر و دیں سے ہو گیا بالا مرا محوِ جمال
اک نظر سے تفرقے سارے مٹا دیتی ہُوں مَیں
عشق کے چرچوں کو دیتی ہُوں نویدِ زندگی
حُسن کے جلووں کو پیغامِ بقا دیتی ہُوں مَیں!

آور کر دیتی ہُوں اس اُجڑی ہوئی محفل کا رنگ

اپنے افسُوں سے اسے جنّت بنا دیتی ہُوں مَیں

گامزن جس پر رہے ہیں صوفیانِ باصفا

عالمِ قُدسی کی وہ راہیں دکھا دیتی ہُوں مَیں

جس کی لَے پر بزمِ انجم میں رہا کرتا ہے رقص

گوشِ باطن کو وُہی نغمے سُنا دیتی ہوُں مَیں

طائرانِ خوشنوا کو پھانسنے کے واسطے

دامِ رنگیں حُسنِ ظاہر کے بچھا دیتی ہُوں مَیں

تربیت کے ہوں جو قابل اُن کو رکھ لیتی ہوں پاس

باقیوں کو ہاتھ سے اپنے اُڑا دیتی ہُوں مَیں

اُس پہ چاہت اپنی چھڑکتی ہوں بصد ذوق و وفا

دہر میں دلدادہ اپنا جس کو پا لیتی ہُوں مَیں

چاہنے والے کا اپنے از رہِ عزّ و وقار
مرتبہ شاہانِ عالم سے بڑھا دیتی ہوں میں
فکرِ دُنیا کے عوض دیتی ہوں فکرِ معنوی
سوچ اے محروم! کیا لیتی ہوں؟ کیا دیتی ہوں میں؟
شکوہ تیرا بھی سُنا۔ لیکن مجھے جو تجھ سے ہے
وہ شکایت ایک مطلع میں سُنا دیتی ہوں میں
کب مری زلفوں کے پھندوں میں اُلجھ کر رہ گیا؟
دل ترا دُنیا کے دھندوں میں اُلجھ کر رہ گیا!

مناظرِ قدرت

صحرا

شہر کی گلیوں میں گھبراتا ہوں میں　　دل کو بہلانے یہاں آتا ہوں میں

دل کی آسائش نہیں پاتا ہوں میں　　تیری وسعت پر مٹا جاتا ہوں میں

گو نہیں مجھ کو جنوں، سودا نہیں

تجھ سے بڑھ کر جا کوئی صحرا نہیں!

شہر ہے میرے لئے دشتِ جنوں　　دل کو واں حاصل نہیں ہوتا سکوں

شعلہ زن ہے آتشِ دنیائے دوں　　رکھتی ہے دل کو سدا سیماب گوں

آہ! یہ تیری نسیمِ خوشگوار
ہے مجھے سرمایۂ صبر و قرار

ہیں قریبِ شہر کچھ باغ و چمن
بیگماں ہے دلکشا جن کی پھبن

ہیں شگفتہ اُن میں نسرین و سمن
طائرانِ خوشنوا ہیں نغمہ زن

بلبل و گُل کے مگر جھگڑوں کے خار
پہلوئے تسکیں کو کرتے ہیں فگار

ہے جو حاصل تیرے دامن میں قرار
وہ کہاں؟ پھرتا رہوں شہر و دیار

خاک تیری مرہمِ قلبِ فگار
سوزنِ زخمِ جگر ہر نوکِ خار

ہے تپِ دُنیا اُتر جاتی یہاں
رُوح کچھ کچھ چین ہے پاتی یہاں!

ناقۂ رعنائے لیلائے خیال
تجھ میں آتا ہے نظر با صد جمال

دل سے مٹ جاتے ہیں فرقت کے ملال
تیری محفل ہے مجھے بزمِ وصال

تیری جلوت میں ہے خلوت کا سماں

تیری کثرت میں ہے وحدت کا سماں

دم تخیّل کا نہیں گھٹتا یہاں ہے زمیں پھیلی ہوئی، دُور آسماں

دیکھ کر افکار کی جولانیاں گرد میں ہوتا ہے خود صحرا نہاں

ہے یہاں وسعت خیالوں کے لئے

ہے یہ میداں فکر والوں کے لئے!

روبرو ہے ہر طرف ساری زمیں صاف آتا ہے نظر چرخِ بریں

آہ! جنگل کی فضائے دل نشیں کوہ و دریا کے مناظر ہیں کہیں

گھُومتا ہے ہر طرف خطِّ نظر

مرکزِ اَور دائرِ عالم ہے بشر!

ہے ترا ہر فصل میں منظر نیا دیکھتا ہُوں مَیں تجھے اکثر نیا

سبز جوڑا ہے کبھی تن پر نیا لالہ و گُل کا کبھی زیور نیا

سال میں کیا کیا بدلتا رنگ ہے

اِک سے اِک بڑھ کر نکلتا رنگ ہے!

تُو ٹھکانا غم کے ماروں کے لئے
امن کا گھر بے قراروں کے لئے

دل کی راحت دلفگاروں کے لئے
الغرض ایسے ہزاروں کے لئے

دہر میں اک بے بدل ماوا ہے تُو

جنّت الماوا ہے یا صحرا ہے تُو!

آندھی

توصیف لب پہ لالہ وگُل کی سدا رہی

پیشِ نظر خرامشِ بادِ صبا رہی

محروم! دلفریب یہ طرزِ ادا رہی
اِک ڈھنگ پر مگر تری طبع رسا رہی
اب یہ دکھا کہ رنگ بدلتی ہے کس طرح
آندھی کلورکوٹ کی چلتی ہے کس طرح!

وہ گرد کا پہاڑ اُٹھا پھر شمال سے
بالیدگی میں دو قدم آگے خیال سے!
صورت میں ہے اگرچہ یہ باہر مثال سے
آتی ہے فوجِ دیو نظر چال ڈھال سے!

رُو پوش اُس کے خوف سے کوہِ گراں ہُوا
ہیبت وہ ہے کہ زرد رُخِ آسماں ہُوا!
ہر سمت آ رہی ہے سراسیمگی نظر
بے چارگی کی بن گئے تصویر سب شجر!

شاخوں میں چھپتے پھرتے ہیں طائر اِدھر اُدھر
مامن کی راہ دَوڑ کے لینے لگے بشر

چوپائے بھانپ کر یہ مصیبت کہاں گئے؟
ان بے کسوں کے سینگ سمائے جہاں، گئے!

آتی ہے مثلِ اژدرِ صحرا پھُنکارتی
للکارتی فلک کو زمیں کو پُکارتی

ذرّوں کو تا بہ چرخِ چہارم اُبھارتی
اُڑتے ہُوؤں کو اَوجِ فضا سے اُتارتی

یکساں بلند و پست پہ چھاتی ہوئی چلی!
ہل چل زمیں زماں میں مچاتی ہوئی چلی!

جڑ سے اُکھڑ کے نخلِ تناور کہیں گرا
ٹہنا کسی غریب کے سر پر کہیں گرا!

چھجّا اُڑا کہیں سے تو چھپر کہیں گرا
دیوار سے اُکھڑ کے کوئی در کہیں گرا
جو چیز صحن میں تھی وہ صحرا میں جا پڑی
اہلِ زمیں پہ کیسی یہ افتاد آ پڑی !

چکّر سے گرد باد کے چکرا گئی زمیں
دیکھا یہ زورِ شور تو گھبرا گئی زمیں
جھونکوں کے ساتھ اُڑتی ہوئی آگئی زمیں
بس اب کسی ستارے سے ٹکرا گئی زمیں!
آثار ہیں ظہورِ قیامت کے سربسر
اجزائے دھر ہوتے ہیں اے وائے منتشر!

جب آسماں پہ اس کا عَلَم ہو گیا بلند
کرنے لگے بچاؤ کی تدبیر ہوشمند

تا بامِ چرخ جس کی رسائی ہو بے کمند
کس کی مجال ہے جو کرے اس کی راہ بند
چُھپ چُھپ لاکھ بیٹھئے کب چھوڑتی ہے یہ
دروازے کھٹکھٹاتی نہیں۔ توڑتی ہے یہ!
آندھی نہیں نمونۂ قہرِ خدا ہے یہ
شعلوں سے تند خو ہے بظاہر ہوا ہے یہ
بارش ہے جس کی خاک وہ کالی گھٹا ہے یہ
تھمنے پہ اب تو آگئی شکرِ خدا ہے یہ
صحرا کی طرح بند مکانوں میں گرد ہے
نتھنوں میں، مُنہ میں، آنکھوں میں کانوں میں گرد ہے!
افسوس مَیں ہُوں اور یہ صحرائے ہولناک
اُڑتی ہے جس میں شام سحر آسماں پہ خاک!

ہیں جُھنڈ جائے سرو تو گُلبن کے بدلے آک
دل اس الم میں دامن گل کی طرح ہے چاک
ان خاکباریوں سے گئی وہ صفائے طبع
اب پھول کیا زمینِ سخن میں کھلائے طبع؟

عالمِ آب

دریائے سندھ کی طغیانی کا نظّارہ

جامِ لبریز کی مانند چھلک کر دریا
دُور تک اپنے کناروں سے پرے پھیل گیا
ہر طرف پانی ہی پانی کا جو نقشہ دیکھا
مصرعۂ تر یہ کسی کا مِرے لب پر آیا

ہر کجا مے نگرم ، عالم آب است اینجا !

ہوئی اس درجہ سرِ سطحِ زمیں وسعتِ آب
کہ فلک مجھ کو نظر آنے لگا مثلِ حباب
آب در آب ہے یا پانی میں ہے عکسِ سحاب
نیچے اوپر یہی پانی کے نظارے ہیں جناب
ہر کجا مے نگرم ، عالم آب است اینجا !

فوجِ امواج نے ہر سمت جو مارے میداں
کثرتِ آب سے اب بحر ہیں سارے میداں
دور پانی سے جو تھے ایک کنارے میداں
سربسر ہو گئے غرقاب بچارے میداں
ہر کجا مے نگرم ، عالم آب است اینجا !

قریہ و دیہہ میں دکھاتا ہے روانی پانی

گلی کوچوں میں خرابی کا ہے بانی پانی
گاؤں والوں کا ہُوا دشمنِ جانی پانی
غرض آبادی و ویرانہ ہے پانی پانی
ہر کجا مے نگرم، عالمِ آب است اینجا!

ہے کہیں ڈوبا ہُوا سبزۂ تر پانی میں
اور پودے ہیں کہیں تا بہ کمر پانی میں
کیا تعجب؟ ہیں گر استادہ شجر پانی میں
یہ جگہ وہ ہے کہ رہتے ہیں بشر پانی میں!
ہر کجا مے نگرم، عالمِ آب است اینجا!

پانی رُک رُک کے ہُوا جاتا ہے بیتاب کہیں
موجیں اُٹھتی ہیں کہیں اور ہے گرداب کہیں
کہیں اِک زور کا ریلا ہے تو سیلاب کہیں

تا بگردن ہے کہیں اور ہے پایاب کہیں

ہر کجا مے نگرم، عالم آب است اینجا!

پھولا ہوا ہے کس لئے؟ کیا بلبلے میں ہے

اللہ! کون سی یہ ہوا بلبلے میں ہے

اُف! کس قدر غرور بھرا بلبلے میں ہے

فرعون کوئی آکے چھپا بلبلے میں ہے

کتنا اُبھار، کتنی اکڑ، کیسی شان ہے

پانی کی ایک بوند میں کیا آن بان ہے!

ہے آب و تاب خوب، مگر یہ گہر نہیں

ہے تاج یہ کسی کا، مگر زیبِ سر نہیں

گنبد عجیب سا ہے، مگر کوئی در نہیں

سر میں ہوا ہے اس کے، مگر یہ بشر نہیں

دم خم کے ساتھ بھی نہیں تلوار بلبلہ

پھر چیز کیا ہے اے اُولو الابصار بلبلہ!

یارب! کسی کا آبلۂ پا ہے بلبلہ

یا دل جلوں کے دل کا پھپھولا ہے بلبلہ

فوراً نہاں نظر سے جو ہوتا ہے بلبلہ

مجھ کو یقیں ہے بیضۂ عنقا ہے بلبلہ

یہ بلبلہ ہے یا کہ طلسمِ حیات ہے!

پیدا ابھی ہوا ابھی نذرِ ممات ہے!

چھوٹا سا ایک خیمۂ آبی کہوں اِسے
یا گنبدِ فلک سے مَیں تشبیہ دُوں اِسے
جامِ بلور ہے جو کروں واژگوں اِسے
کس مستِ بادہ خوار نے پھینکا نگوں اِسے

کس نازنیں کی بزم کا یارب! یہ جام ہے
سارے جہاں کی ناز کی جس پر تمام ہے!

محروم! اس کو چشمِ بصیرت سے دیکھئے
اپنی نگاہِ عاشقِ قُدرت سے دیکھئے
کچھ سوچئے جناب! نہ حیرت سے دیکھئے
ہر ایک شئے کو دیدۂ عبرت سے دیکھئے

جویائے کُنہِ رازِ نہاں کے لئے یہاں
عالم کا ذرّہ ذرّہ ہے اسرار کا جہاں

✓ ہے وقت موجِ آب رواں اور یہ بشر

ہے بلبلہ کہ اپنی فنا سے ہے بے خبر

آجائے ایک موجۂ بادِ فنا اگر

رہ جائے بلبلے کی طرح ٹوٹ پھوٹ کر

کرتا ہے بلبلہ سبق آموزیٔ فنا!

دیتا ہے آدمی کی حقیقت کا یہ پتا

پانی کی بوند بوند بشر اور حباب ہیں

اور دونوں اس جہان میں نقش بر آب ہیں

دونوں مئے غرور سے مست و خراب ہیں

اور اس لئے غریقِ یم پیچ و تاب ہیں

دل میں اگر خودی نہ ہو، سر میں ہوا نہ ہو

ہوں اپنی اپنی ذات میں، صورت جدا نہ ہو!

سندھ کو پیغام

اے رودِ کرم! کیجیو پیغام رسانی
جب دُور سے آجائے نظر سندھ کا پانی
جو کچھ کہوں، للہ! اُسے یاد سے کہنا
حسرت بھری آواز میں، فریاد سے کہنا
کہنا کہ مسافر کوئی آوارۂ غربت
دیتا تھا سلام اور یہ کہتا تھا بہ حسرت
اے آبِ اباسین کہ بصد موج رواں ہے
معلوم ہے تجھ کو، ترا شیدائی کہاں ہے؟

باچاکِ گریباں وہ کہیں خاک بسر ہے

مشغول تری یاد میں با دیدۂ تر ہے

آتے ہیں اُسے یاد ترے سبز کنارے

بیچارے کی آہوں سے نکلتے ہیں شرارے

وہ سبزۂ ساحل کا ترے نرم بچھونا

ساون میں مرا زیرِ شجر چین سے سونا

ساون کی گھٹاؤں کا وہ پھر جھوم کے آنا

وہ ناچنا موجوں کا، پرندوں کا وہ گانا!

طفلی وہ مری، اور وہ معصوم اُمنگیں

اے وائے! وہ دل خوش کُن موہوم اُمنگیں

وہ کھیلنا میرا تری امواج سے دن بھر

وہ چھیڑ مری بُلبُلے کے تاج سے دن بھر

خورشیدِ جہاں تاب کا وہ چھب سے نکلنا
محروم کا وہ شوق میں بستر سے اُچھلنا
نُورانی دوپٹے میں کرن کا وہ نکھرنا!
سو ناز سے اُس کا وہ عروسانہ اُترنا!
تعظیم میں اُس کی، وہ تری ناصیہ سائی
اور ذوقِ تمنّا میں وہ آغوش کُشائی
وہ چھیڑنا اُس کا تجھے اور آ کے نہانا
اے سندھ! وہ تیرا اُسے چھاتی سے لگانا
کیا خوب تھے برسات میں قدرت کے نظارے
کثرت نے دکھائے مجھے وحدت کے نظارے
وہ کون سا قطرہ تھا جو ہستی کو مٹا کے
آگاہ نہ کرتا گیا اسرارِ بقا سے

پھرتا ہُوں اُسی خواب پریشاں میں ابھی تک
نقشے ہیں وہی دیدۂ حیراں میں ابھی تک!
اے آہ! وہ بحروں کی روانی کے نظارے
بھُولیں گے نہ مجھ کو کبھی پانی کے نظارے
ملّاحوں کے ہیں گیت مجھے یاد ابھی تک
چپکے سے ہے گاتا دلِ ناشاد ابھی تک
قابو سے نکل کشتی کا گرداب میں آنا!
ملّاح کی عورت کا وہ یُوں شور مچانا!
"اللہ بچالے! مرے اللہ بچالے!
عاجز ہُوں میں، سب کچھ ہے مرا تیرے حوالے
او ورطۂ خونخوار! یہ بیداد نہ کرنا
اے میرے خدا! مجھ کو تو برباد نہ کرنا!

ہاں! المدد اے حضرتِ الیاس بچانا
بے کس ہوں، بچانا، ہے تری آس بچانا
کس کنج میں خوابیدہ ہو پورب کی ہواؤ!
پہنچو مری کشتی کو تمہیں آکے بچاؤ
تقدیر نے کشتی جو پھنسائی ہے بھنور میں
کشتی مری امّید کی آئی ہے بھنور میں!"
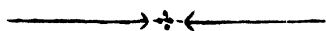
کنارِ راوی

غمِ دل آفتِ سماوی ہے — زندگی موت کے مساوی ہے
زخمِ پنہاں جگر پہ حاوی ہے — اشک ریزی جگر تراوی ہے

شامِ غم ہے، کنارِ راوی ہے

میں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے!

ہم کہاں اور سیرِ باغ کہاں ذوق و شوق و دل و دماغ کہاں

گلشنِ دہر میں فراغ کہاں چین دیتے ہیں دل کے داغ کہاں

شامِ غم ہے، کنارِ راوی ہے

میں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے!

اُڑ چلے طائر آشیانوں کو ملا آرام باغبانوں کو

نغمے یاد آئے نغمہ خوانوں کو کیا کروں سُن کے میں ترانوں کو

شامِ غم ہے، کنارِ راوی ہے

میں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے!

خواہ چرواہے، خواہ چوپائے شوق سے اپنے گھر کو پھر آئے

خانہ ویراں کو گھر جو یاد آئے کیا کرے؟ ہائے! کوئی بتلائے

شامِ غم ہے، کنارِ راوی ہے

مَیں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے!

مہرِ تاباں تھا مائلِ آرام   کوہِ مغرب میں جا کیا بسرام

سو گیا لے کے تن پہ چادرِ شام   اُس کے آرام سے مجھے کیا کام

شامِ غم ہے، کنارِ راوی ہے

مَیں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے!

آنکھ کھولی اِدھر ستاروں نے   جلوے دکھلائے ماہ پاروں نے

گو اشارے کئے ہزاروں نے   آنکھ اُٹھائی نہ غم کے ماروں نے

شامِ غم ہے، کنارِ راوی ہے

مَیں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے!

جلوے دکھلائے گورے گالوں نے   جال پھیلائے کالے بالوں نے

دل کئے نذرِ شوق والوں نے   مجھ کو گھیرا مرے خیالوں نے

شامِ غم ہے، کنارِ راوی ہے
مَیں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے!

کئی بچھڑے ہوئے مِلے ہونگے — شکوے کچھ ہونگے کچھ گلے ہونگے
آرزوؤں کے گُل کھلے ہونگے — دامنِ شوق میں صِلے ہونگے

شامِ غم ہے، کنارِ راوی ہے
مَیں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے!

مَیکدوں میں چراغ روشن ہیں — نُورِ مے سے ایاغ روشن ہیں
کرمکِ شب چراغ روشن ہیں — یا مرے دل کے داغ روشن ہیں

شامِ غم ہے، کنارِ راوی ہے
مَیں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے

بیقراری ہے، کیا خبر، کیوں ہے؟ — آہ و نازی ہے، کیا خبر، کیوں ہے؟
دلفگاری ہے، کیا خبر، کیوں ہے؟ — اشکباری ہے، کیا خبر، کیوں ہے؟

شامِ غم ہے، کنارِ راوی ہے
مَیں ہُوں اور میری سینہ کاوی ہے!

آہ! اے دَورِ نوجوانی، آہ!　　آہ! اے موت کی نشانی، آہ!
کیا ہوئی دل کی شادمانی، آہ!　　ہے کدھر مرگِ ناگہانی، آہ!

شامِ غم ہے، کنارِ راوی ہے
مَیں ہُوں اور میری سینہ کاوی ہے!

دلِ وحشی کا مُدّعا غم ہے　　ابتدا غم ہے، انتہا غم ہے
یُوں تو دل پر مرے سدا غم ہے　　غمِ مرگِ پدر نیا غم ہے

شامِ غم ہے، کنارِ راوی ہے
مَیں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے!

المدد! سیلِ گریۂ خوں ناب　　سوزِ پنہاں سے ہو چلا ہوں کباب
گلخنِ غم میں ہے دلِ بیتاب　　کہ تڑپتا ہے صورتِ سیماب

شامِ غم ہے، کنارِ راوی ہے
مَیں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے!

عید بھی ہو مجھے محرّم ہے
میرا سینہ ہے، خنجرِ غم ہے
خونفشاں کب سے چشمِ پُرنم ہے
دشتِ غربت ہے، شامِ ماتم ہے

شامِ غم ہے، کنارِ راوی ہے
مَیں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے!

گنگاجی

جوش زن رحمتِ یزداں ہوئی دریا ہو کر
بہ چلی عالمِ اجسام میں گنگا ہو کر!

آئی ہے رہِ عالم بالا ہو کر
رہ گئے کچھ ترے قطرات ثریا ہو کر!

عرش اور فرش ہوئے تجھ سے منور گنگا
مظہرِ نورِ ازل ہے تو سراسر گنگا!

نورِ سیال ہے یا جلوۂ رقصاں ہے تو
حیرت افروزِ دل و دیدۂ حیراں ہے تو
کس دلآویزی و تیزی سے خراماں ہے تو
مجھ کو حیرت ہے نمایاں ہے کہ پنہاں ہے تو

حسنِ بیتاب! نمائش سے پشیماں کیوں ہے؟
پردۂ رخ ترا جلوہ ہے گریزاں کیوں ہے؟

کیوں گریزاں ہے؟ کہ دنیا کو ضرورت ہے تری
ماحیٔ ظلمتِ عصیاں ابھی طلعت ہے تری

رُوح کو چین ملے جس سے وہ صورت ہے تری
دافعِ آفتِ آلامِ محبّت ہے تری
یاد آجاتی ہیں جس دم تری گنگا موجیں
مارتا دل میں ہے "تقدیس کا دریا موجیں!

منزلِ عالمِ اسرار کنارا تیرا
ساحلِ بحرِ حوادث ہے سہارا تیرا
چشمِ جویا کو غنیمت ہے نظارا تیرا
کہ ہے فردوسِ نظر حسنِ دل آرا تیرا!
پاک رُوحوں سے تری انجمن آباد رہے!
نغمۂ اوم سے ترا چمن آباد رہے!

ہلالِ عید

دیکھو! دیکھو! وہ مَیں نے دیکھ لیا
قلّۂ کوہ سے ذرا اُونچا

چھُپ گیا! چھُپ گیا! کہیں دیکھو
پھر نظر آئے گا وہیں دیکھو

وہ جو ہے سامنے شجر، دیکھو!
اُس سے اُوپر اُٹھا نظر دیکھو!

اے لو! اے لو! وہیں نظر آیا

مژدہ! اے شائقیں نظر آیا!

مرحبا! اے ہلالِ شامِ سعید
لے کے آیا ہے تُو بشارتِ عید

مخبرِ صبحِ عیش و عشرتِ عید
تجھ سے وابستہ ہے سعادتِ عید

مژدۂ عید ایک شب پہلے
لائے گا، جانتے تھے سب پہلے

پر یہ تھی انتظار کی صورت
کہ نہ دیکھی قرار کی صورت

تھا تری جستجو میں پیکِ نظر
دشتِ بالا میں گرمِ قطعِ سفر

کہ یکایک کرم کیا تُو نے
اپنا چہرہ دکھا دیا تُو نے

تُو کفیلِ نشاطِ عالم ہے
باعثِ انبساطِ عالم ہے

تُو عجب شے ہے میکشوں کے لئے
کشتیٔ مے ہے میکشوں کے لئے

دُور سے یہ ترا اشارا ہے
اَوج پر عیش کا ستارا ہے!

واہ! اے شاہدِ کماں ابرُو
کس ادا سے تنا ہُوا ہے تُو!

خود نمائی بھی ہے، ادا بھی ہے
اس پہ پھر کاہشِ حیا بھی ہے

یہ ترا بانکپن! یہ رعنائی!
بزمِ بالا میں خلوت آرائی!

ہے سزاوار تجھ کو ناز و غرور
کھینچ بیشک تُو اپنے آپ کو دُور

سارا عالم ہے ترا شیدائی
سب کو دیکھا ترا تماشائی

تھی زمانے کو جستجو تیری
محفلوں میں تھی گفتگو تیری

چشمِ بد دُور! کیا نزاکت ہے

تجھ پہ بارِ نظر بھی آفت ہے!

یوں عیاں ہے شفق کے دامن میں
جیسے مہ رُو ہو کوئی گلشن میں

یا کوئی جیسے خنجرِ نازک
زینتِ دستِ دلبرِ نازک

خونِ عاشق سے سُرخرو ہو کر
ناز کرتا ہو اپنی برّش پر

یا کوئی جیسے نقرئی کشتی
قُلزمِ سُرخ پر ہو تَیر رہی

اِک جہاں اُس کا ہو تماشائی
کرتی جائے وہ بحر پیمائی

رفتہ رفتہ نظر سے غائب ہو
تکتے رہ جائیں لوگ سب اُس کو

اے لو! سچ مچ وہ صورتِ زورق

ہو گیا گم میانِ شام و شفق!
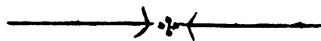
ماہِ تاباں

چرخ پر کس کا چراغِ انجمن روشن ہوا
نور سے جسکے مرا بیت الحزن روشن ہوا
چاندنی گلگشت کو اُتری، چمن روشن ہوا
آشیانِ عندلیبِ نغمہ زن روشن ہوا

مرحبا اے ماہِ تاباں، حبّذا اے چاندنی!
دیر باش اے ماہِ تاباں، خوش بیا اے چاندنی!

او مہِ تاباں! ترا کب سے تماشائی ہوں مَیں!
تیرے جلووں سے جنوں بڑھتا ہی سودائی ہوں مَیں
سر بسر وارفتۂ شانِ دل آرائی ہوں مَیں
حسنِ دلکش کی قسم! تیرا تمنّائی ہوں مَیں

شاہدِ اوجِ فلک ! ہاں مسکرائے جا یُوں ہی !
اور مجھ کو پیکرِ حیرت بنائے جا یُونہی !

تھا کبھی تو ایک جادو کا کھلونا ہائے ہائے
وہ نظر آنا ترا، حاصل نہ ہونا ہائے ہائے
رات کو پہروں مچلنا، اور نہ سونا ہائے ہائے
نیند کی وادی میں آخر تجھ کو کھونا ہائے ہائے

وہ ہجومِ ذوقِ پنہانی دلِ بے تاب میں
تیرے پیچھے اُڑ کے جانا آسماں پرخواب میں!

تجھ کو خالق نے بنا کر آہ! پُتلا نُور کا
نُور کی پوشش عطا کی، اور سراپا نُور کا
دے دیا تاروں کا جھومر، یعنی گہنا نُور کا
اور نورانی گلے کا زیب، ہالا نُور کا

موہنی مورت نے پایا کیا مزاجِ نرم ہے

اے حسینانِ تکبّر خُو! مقامِ شرم ہے!

دیکھتا ہے کس نظر سے آہ ہیئت داں تجھے

ہے بنا دیتا وہ ظالم خطّۂ ویراں تجھے

کیوں بنائے اک معلّق گولِ کوہستاں تجھے

اس کے کہنے سے مگر کیا اے ماہِ تاباں تجھے

اس کی باتوں سے تری رونق بھلا کیونکر ہو ماند

یہ مثل ہے "خاک ڈالے سے کہاں چھپتا ہے چاند"

تجھ کو یہ الزام بھی ملتا ہے اے روشن عذار

روشنی مانگی ہوئی ہے، حُسن تیرا مستعار

ان کے طعنوں سے نہ کر تُو اپنے دل کو داغدار

ہاں اسی قانون پر ہے سارے عالم کا مدار

وہ بھی لیتا ہے کسی سے، جس سے تو لیتا ہے نُور
اور ہے وہ نور والا، سب کو جو دیتا ہے نُور!

چاند سورج جس کے لاکھوں ہیں ستارے بےحساب
کتنے ساکن ان میں ہیں، کتنے ہیں سرگرمِ شتاب
ہے ضیا جن کی انوکھی، حُسن جن کا لاجواب
تیری صورت کے بھی ہیں ان میں کئی اے ماہتاب!
نور کا مخزن ہے اک، سب کو دئے جاتا ہے نُور
وہ سراپا نُور ہے، دُنیا میں پھیلاتا ہے نُور

آہ! پھر اس خاکدانِ تیرہ میں ظلمت ہے کیوں؟
سایۂ عصیاں سے کالی رات کی صُورت ہے کیوں؟
بحرِ ہستی میں بپا طوفان پر آفت ہے کیوں؟
کیوں جہازِ عُمر چکراتا ہے؟ یہ ہیبت ہے کیوں؟

کیوں یہ ہیبت ناک چیخیں ہیں؟ یہ کیسا شور ہے؟
بڑھتا جاتا کیوں مصیبت کی گھٹا کا زور ہے؟

تُو کدھر ہے آہ! اے حُسنِ ازل کے ماہتاب
تا کجا اوڑھے رہے گا منہ پہ دامانِ سحاب؟

خانۂ دل ہو نہ جائے اس اندھیرے میں خراب
ڈال دے کوئی شعاعِ شفقت آلودہ شتاب

تیرے جلوے کاش! ہو جائیں قریبِ چشمِ دل
خوابِ غفلت ہو نہ پھر ہرگز نصیبِ چشمِ دل!

وقتِ سحر

ستاروں کا گلزار وقفِ خزاں ہے
بہارِ سحر سے جہاں شادماں ہے
شفق سے فلک تختۂ ارغواں ہے
زمیں رشکِ ساحتِ گلستاں ہے

مسرّت سے لبریز سارا جہاں ہے

سُہانا سُہانا سحر کا سماں ہے!

نہ تھا خوابِ غفلت ذرا موت سے کم
جہاں پر تھا شہرِ خموشاں کا عالم

نسیمِ سحر بسکہ تھی عیسوی دم
دوبارا ہُوا ایک بیک زندہ عالم

نئے سر سے پھر آگئی سب میں جاں ہے

سُہانا سُہانا سحر کا سماں ہے!

نسیمِ سحر دل کُشا، روح پرور
شمیمِ گُلِ تر سے عالم مُعطّر

پرندوں کے جاں بخش نغمے ہُوا پر
وہ تانیں کہ ہر آن جن سے برابر

سُرورِ مئے شادمانی عیاں ہے

سُہانا سُہانا سحر کا سماں ہے!

پیامِ مسرّت صبا لے کے آئی
ہنسے پھُول، ہر اک کلی مُسکرائی

شگوفے ہوئے مائِل لب کُشائی
طیُورِ چمن محوِ رنگیں نوائی

ہجومِ طرب باغ کے درمیاں ہے
سُہانا سُہانا سحر کا سماں ہے!

وہ سوتا ہے شب بھر جو بیمار جاگا وگرنہ نہیں کون جاندار جاگا
عبادت کو مردِ نکوکار جاگا خرابات میں رندِ مے خوار جاگا

اُٹھا طفلِ کم سن تبسّم کُناں ہے
سُہانا سُہانا سحر کا سماں ہے!

اذاں اور ناقُوس نے غُل مچایا کہ اے غافلو! وقت اُٹھنے کا آیا
مبارک ہیں بیشک وہ انساں خُدایا ترے سامنے سر جنھوں نے جُھکایا

یہی وقتِ خرّم سعادت نشاں ہے
سُہانا سُہانا سحر کا سماں ہے!

شہنشاہِ خاور کا پا کر اشارا ہُوئی ہے وہ پہلی کرن جلوہ آرا
سرِ تاجِ زرّیں ہوُا آشکارا وہ ظاہر ہوُا روئے خورشید سارا

زمیں تابِ شبنم سے گوہر فشاں ہے

سُہانا سُہانا سحر کا سماں ہے!

چمکتا ہے سُورج، دمکتی ہے دُنیا　　لپکتی ہیں موجیں، جھکتے ہیں دریا

چٹکتی ہیں کلیاں، لہکتا ہے سبزہ　　مہکتا ہے گلزارِ عالم سراپا

چہکتی اُڑی بُلبلِ نغمہ خواں ہے

سُہانا سُہانا سحر کا سماں ہے!

وہ ہل چل مچی شہر و دشت و جبل میں　　تموّج سا پیدا ہوا جل میں، تھل میں

نئی تازگی آگئی پھُول پھل میں　　چمک اُٹھے شبنم کے قطرے کنول میں

رگِ دہر میں خونِ فرحت رواں ہے

سُہانا سُہانا سحر کا سماں ہے!

سُنہری ہوئی کوہساروں کی رنگت　　رُپہلی ہوئی آبشاروں کی رنگت

غضب ڈھا گئی لالہ زاروں کی رنگت　　ہے اک برگ میں سو بہاروں کی رنگت

زمینِ چمن عکسِ باغِ جناں ہے
سُہانا سُہانا سحر کا سماں ہے!

اُٹھا ذوقِ نظّارہ میں مُنہ اندھیرے
نظر آئے نُورِ سحر کے پھریرے

لکھی نظمِ دلکش سویرے سویرے
ہوئے پیکرِ نُور اشعار میرے

خصوصاً یہ مصرعہ کہ وردِ زباں ہے
سُہانا سُہانا سحر کا سماں ہے!
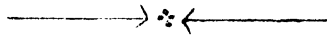
بندرابن کی ایک صُبح

آثار عیاں ہوئے سحر کے
ساماں ہونے لگے سفر کے

ہل چل میں ہے کاروانِ انجم
مغرب کو چلا نشانِ انجم

وہ شب کا سیاہ شامیانہ اب لے کے قمر ہؤا روانہ

تارے سب ایک ایک کر کے آگے پیچھے چلے قمر کے!

مشرق میں ہے نُور ہلکا ہلکا

ظلمت کا ظہور ہلکا ہلکا!

صُبح خنداں عروسِ تازہ آئی مَل کر شفق کا غازہ

آئی اور کس ادا سے آئی شانوں پر کاکلیں طلائی

چہرہ اُس کا وہ، یعنی خورشید بے پردہ، عدوِ حسرت دید

ہر چیز کو پرتوِ سحر ہے قدرت نے رنگا ہے رنگِ زر سے

جمنا ابھی خواب سے اُٹھی ہے

پیدا بُشرے سے تازگی ہے

کرنیں جمنا سے کھیلتی ہیں ظلمت کو پرے دھکیلتی ہیں

ہے محوِ خرامِ ناز جمنا! عشاق کی دلنواز جمنا!

ساحل پہ دوب، دوب پہ اوس   مخمل تو ہے دوب اور گہر اوس

جمنا کا لباس مخملی ہے   اور موتیوں سے لدی ہوئی ہے

جنگل کے وہ پھول آہ! خود رو

بھینی بھینی وہ اُن کی خوشبو

دھیمے دھیمے صبا کے جھونکے   اندازِ خرام وہ گلوں کے

طائر ہر سمت نغمہ زن ہیں   یہ مطربِ محفلِ چمن ہیں

ہر چند ہے دلپذیر جمنا   کب دل کو مگر یہاں ہے تھمنا

جمنا سے نہیں ہے کام ہم کو   ہے ذوقِ لقائے شام ہم کو

مل جائے ہمیں کہیں کنھیا

آرامِ دلِ حزیں کنھیا!
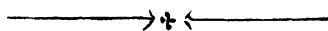
بانسری کی کوک

لعلِ معجز نما سے بنسی — اے لو! وہ شام نے لگا دی

پیدا ہوا اک نفس سے اعجاز — اب اس سے زیادہ کونسا ساز؟

ہر ایک ترانہ دلربا سے — جنگل نغموں سے گونج اُٹھا ہے

عالم طاری ہے بے خودی کا — نغمہ ساری ہے بانسری کا

طائر اشجار پر ہیں خاموش — محوِ لذّاتِ جنّتِ گوش

مُرغِ تصویر ہر پرندہ — پا در زنجیر ہر چرندہ

سکتے میں کھڑے ہوئے ہیں آہو — گویا کوئی کر گیا ہے جادو

دُم ناچنے کو ہوئی چنور ہے — پر اپنے سے مور بے خبر ہے

اِک جذبۂ بے خودی میں آ کے — لہراتے ہیں سانپ پھن اُٹھا کے

مسحور ہر ایک جانور ہے — چیتا یا شیر یا کہ گر ہے
جنگل کی ہر ایک بھینس گائے — سکتے میں ہے اپنا مُنہ اُٹھائے

جب وحشیوں کا ہُوا ہے یہ طَور
حالت انساں کی کیوں نہ ہو اَور!

گاؤں سارا گوالیوں کا — ہے محوِ سکوت اب کچھ ایسا
گویا آباد ہی نہیں ہے — خالی انساں سے یہ زمیں ہے
بیکار ہیں، جو ابھی تھے مشغول — کس شغل میں تھے؟ یہ سب گئے بھول
کھیتوں میں جو ہل چلا رہے تھے — اور ساتھ ہی گُنگُنا رہے تھے
چُپ چاپ وہ اب کھڑے ہوئے ہیں — گویا کہ وہیں گڑے ہوئے ہیں
بچے گلیوں میں گھر کے اندر — ہیں ناچتے بانسری کی لے پر
سب عورتیں، مائیں، بیویاں سب — خاموش ہیں، نقش ہیں جہاں جہاں سب
ڈالا ہے وہ زیر و بم نے پھندا — چھوڑے بیٹھی ہیں گھر کا دھندا

جوبن جن پر شباب کا ہے | یہ نغمہ اُنہیں تو فتنہ زا ہے
دل کو ہے یہ بے قرار کرتا | آنکھوں کو ہے اشکبار کرتا
رہ رہ کے ہے دل میں درد اُٹھاتا | دل کو ہاتھوں سے ہے اُڑاتا
تھامے ہوئے ہیں جگر کو دل کو | سُنتی ہیں نوائے متّصل کو
جو واقفِ رازِ معرفت ہیں | شنوندۂ سازِ معرفت ہیں

یہ بنسی اُنہیں بھی ہے رُلاتی
پیغام ہے دوست کا سُناتی!

صبح کے ستارے

صورتِ رہروِ سحر تیار | میہماں کوئی دم کی ہے شبِ تار
سوئے مشرق ہے جلوۂ انوار | کہ نمایاں ہیں صبح کے آثار

اوس تاروں پہ پڑنے والی ہے
اب یہ محفل اُجڑنے والی ہے!

نُور کے بحر میں ہے طغیانی ہوئے تارے غریقِ حیرانی
اب کہاں رونقِ درخشانی آہ! سر سے گزر گیا پانی!

تابِ طوفانِ نُور لا نہ سکے
رہ نکل بھاگنے کی پا نہ سکے!

اس طرح آتے ہیں نظر بے نُور جیسے دُھندلا کوئی چراغ ہو دُور
یا کوئی جیسے خوشۂ انگور سُوکھ کر تاک سے گرے مجبُور

یا ہوں جیسے فسردہ اور ملُول
آخرِ موسمِ بہار کے پھُول!

جس طرح یا طفیلِ سوز و گداز کہ ہے دستورِ طالعِ ناساز
اشکِ بیمارِ سالہائے دراز کھو چکے آب و تاب کے انداز

نظر آتے ہیں یونہی بے رونق
مُنہ ہے شمعِ سحر کی صورت فق

ماہ دلگیر، اُداس تارے ہیں   چشمکیں ہیں نہ وہ اشارے ہیں
گویا بجھنے کو یہ شرارے ہیں   پھر بھی دلکش ہیں پیارے پیارے ہیں

اُترے چہرے ہیں مہ جبینوں کے
رُخ پژمردہ ہیں حسینوں کے!
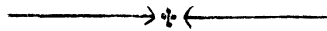
نمودِ شام

رنگِ عشرت کا اہتمام ہُوا   دامنِ چرخ لالہ فام ہُوا
دورِ خورشید کا تمام ہُوا   وقتِ بزمِ سکوت شام ہُوا

سایۂ کوہِ سر فراز بڑھا

صورتِ گیسوئے دراز بڑھا!

آخری شور ہے سرِ اشجار — سخت گھبرائے پھرتے ہیں پَردار

اب کہاں نغمۂ مسرت بار — بدحواسی کے ان میں ہیں آثار

جس طرح کوئی کاروانِ عظیم

کوچ کرنے لگے بحالتِ بیم!

وقت ہے اپنے گھر کو جانے کا — دل نے پُوچھا پتہ ٹھکانے کا

ہوش پینے کا ہے نہ کھانے کا — لے اُڑا شوق آشیانے کا

باغ اِک محفلِ خموش ہوا

دُور ہنگامۂ خروش ہوا!

یُوں ہیں اِستادہ سرو اور چنار — جس طرح مستعد ہوں پہریدار

دِھیما دِھیما ترنّمِ انہار — ہلکا ہلکا سا بج رہا ہے ستار

ایک گوشے میں لالۂ دل سوز
یک بہ یک ہو گیا چراغ افروز!

آفت آئی مریضِ ہجراں پر
حسرت افزا ہے شام کا منظر
ہنستے روتے گیا ہے دن تو گزر
رہِ ظلمات ہو گی طے کیونکر؟

رات بھر بے قراریاں ہوں گی
اور اختر شماریاں ہوں گی!

شفقِ شام

جوشِ گل دامنِ فلک پر ہے
اُڑ رہی یا شرابِ احمر ہے
واہ کیا دلفریب منظر ہے
شفقِ شام جلوہ گستر ہے!

یا اُڑاتا ہے چرخِ شعبدہ کار

باغہائے زمیں سے رنگِ بہار!

یہ نمائش ہے لالہ زاروں کی — یا کہ بستی ہے شعلہ کاروں کی

بزم ہے کوئی گلعذاروں کی — انجمن یا ہے نوبہاروں کی

کسی قاتل کا ہے یہ دامنِ سُرخ؟

کسی بسمل کا یا ہے مدفنِ سُرخ؟

دیدنی ہے یہ منظرِ رنگیں — دلربائی ہیں لبسِ رنگیں

شاہدِ شام پیکرِ رنگیں — زیرِ دامانِ چادرِ رنگیں

دشمنِ ہوش ہے یہ رنگینی

گو نہیں رنگِ مے یہ رنگینی!

قدسیوں نے رچائی ہے ہولی — رنگ اُڑاتا ہے آئی ہے ہولی

آسماں نے مچائی ہے ہولی — واہ! کیا رنگ لائی ہے ہولی

یہ بن اور یہ قبائے رنگ آلود
مسخرا بن گیا ہے چرخِ کبود

آتشِ گُل ہو لاکھ جلوہ فگن — یہ بھڑک کب دکھا سکے گُلشن
نظر آتا ہے جلوۂ گلخن — لمبی چوڑی ہے اک چتا روشن

صورتِ پدمنی کوئی اس پر
شانِ جوہر دکھاتی ہے جل کر!

فصلِ خزاں

گرمی کا ہُوا جو سرد بازار — ایامِ خزاں ہوئے نمودار
اشجار کھڑے ہیں مثلِ بیمار — ہر برگِ شجر ہے زرد رُخسار

تھی دُھوپ جو گرمیوں میں کھائی

تاثیر ہے اُس نے اب دکھائی!

گُل ہے نہ کہیں، کوئی ثمر ہے — بے رونقی برگ و شاخ پر ہے

آلودۂ خاک ہر شجر ہے — رنگِ چمن جہاں دگر ہے!

حسرت کی ہے چھا رہی گھٹا سی

ہر سُو ہے برس رہی اُداسی!

بے لطف نوائے طائراں ہے — وہ جوشِشِ نغمہ اب کہاں ہے

جو لَے ہے وہ صورتِ فغاں ہے — اظہارِ شکایتِ خزاں ہے

اب گرم نہیں لہُو جگر میں

آمد سرما کی ہے نظر میں!

بادل کی کہیں کہیں یہ جالی — ہے مثلِ غُبار مینہ سے خالی

ہر برگ ہو گو کفِ سوالی — ہرگز یہ نہیں برسنے والی!

غمگیں اسے دیکھ کر ہے دل اَور
برسات کا یاد آگیا دَور!

چڑھ چڑھ کے اُتر گئے ہیں دریا   خالی ساحل ہے حسرت افزا
سُوکھا سرِ کوہسار سبزہ   گرد اُڑتی ہے درمیانِ صحرا

فطرت کے فسردہ ہیں مناظر
کیونکر ہو شگفتہ طبعِ شاعر!

رخصتِ سرما

ہیں نکلتی سردیوں کے وہ نظر فریب منظر
کہ پلٹتا مہرِ تاباں بھی سوئے شمال آیا

کھُبی جاتی ہے نظر میں، کہ ہے تازگی پہ نیچر
یہ بدل رہا ہے موسم، کہ پلٹ رہی ہے کایا

نظر آگیا، کہ سرما کا شباب ڈھل چُکا ہے
نظر آتی ورنہ برفِ سرِ کوہ کیوں پگھلتی
جو تھما ہؤا تھا پانی وہ سرک کے بہ چلا ہے
جو ندی جمی ہوئی تھی وہ ذرا ذرا ہے چلتی!

نہ صبا میں ہے وہ خُنکی، نہ نسیم میں ہے ٹھنڈک
کہ دل و جگر کو لگتی ہے یہ خوشگوار ایسی
نہ وہ کڑکڑاتا جاڑا، نہ وہ سردیاں ہیں بیشک
یہ بسنت کی ہوا ہے، یہ ہے رُت بہار ایسی!

نہ چمن کے رہنے والوں کی وہ زرد و رویاں ہیں
کہ اُتر رہا ہے تن سے، جو لباس تھا خزانی
نہ بدن کی لاغری ہے نہ وہ رُخ کی زردیاں ہیں
کہ ہر اک شجر کا جوڑا نظر آرہا ہے دھانی

کہیں پھولتی ہے سرسوں کہیں پھوٹتا ہے سبزہ
نئی کونپلیں نکلتی ہیں کہیں کسی شجر سے
"وہ کب آئیگا چمن میں مجھے جس کی ہے تمنّا!"
کہیں کر رہی ہے بلبل یہ سوال برگِ تر سے

گُل و غنچہ سے بھریگا وہ چمن کے جیبِ داماں
اسی دیکھ بھال میں ہے ابھی باغبانِ قدرت

پسِ پردہ ہو رہے ہیں جو بہار کے یہ ساماں
دل و دیں کو لوٹ لیگا وہ دکھا کے شانِ قدرت

نکل آئے فصلِ گُل کے وہ طیور گھونسلوں سے
کوئی دن میں گونج اٹھینگے بہار کے ترانے
چلی آئینگی مسرّت کی صدائیں جنگلوں سے
کوئی شادیوں میں گاتا ہو خوشی کے جیسے گانے

مگر آہ جس چمن کا میں ہوں عندلیبِ نالاں
ہوئیں مدّتیں کہ اُس میں نہ کبھی بہار آئی
جو گری فلک سے شبنم، رہی تا سحر وہ گریاں
جو صبا کہیں سے آئی تو لئے غبار آئی!

نوائے بہار

خوشا بہار و خوشا فصلِ دلکشائے بہار

خوشا مناظرِ جاں بخش و جانفزائے بہار

نہ زندہ کیوں ہو دلِ کشتۂ ادائے بہار

دمِ مسیح ہوئی جنبشِ ہوائے بہار

بہائے اشکِ مسرت نہ کیوں جب آئے بہار

ہے چشمِ حسن نگہ عاشقِ ادائے بہار

ہر ایک گل شررِ طور ہے بجلوہ گری

کہاں ہے آہ! مجھے تابِ جلوہ ہائے بہار

اُتر نے قافلہ در قافلہ لگے ہیں پھول

زمیں تمام ہوئی کارواں سرائے بہار

ہجومِ گل سے زمیں پر جگہ نہیں باقی
شفق کے پھول فلک پر نہ کیوں کھلائے بہار

ظہورِ صبح ہے نورِ رُخِ عروسِ چمن
سوادِ شام ہے گیسوئے مُشکسائے بہار

یہ گہنے پھولوں کے، اور یہ زمرّدیں پوشاک
ہے برقِ خرمنِ دل حُسنِ فتنہ زائے بہار

چمن پہ، دشت پہ، صحرا پہ، ایک جوبن ہے
ہر اک فضا میں ہے نیرنگیٔ فضائے بہار

اُڑا رہے ہیں چمن میں بہار کے جلسے
طیورِ زمزمۂ پرواز و خوشنوائے بہار

ترانہ ریز ہے محروم موسمِ گل میں
کہ مثلِ بلبلِ گلشن ہے آشنائے بہار

نسیمِ بہار

آسائشِ جگر ہے نسیمِ بہار! تُو
دلکش ہے، دلفریب ہے، اور خوشگوار تُو!
عیسیٰ نفَس ہے دہر میں اے تازہ کار تُو
ہے باعثِ شگفتگیٔ روزگار تُو!

جاں تیرے دم سے تازہ ہے دل باغ باغ ہے
اور بوئے خوشی سے تیری معطّر دماغ ہے!

تجھ سا ہے کون محرمِ عادتِ سرائے گل
کرتی ہے چپکے چپکے تو جذبِ ادائے گُل
جاں بخش تجھ کو ہے نفَسِ عطر سائے گُل

لاتی چرا چرا کے ہے بوئے قبائے گل!

تاثیر فیضِ صحبتِ گل اے نسیم! ہے
نگہت ندیم ہے تری، ہمدم شمیم ہے

خوشبو سمیٹ صحنِ چمن سے جو تو گئی
بیخود اسے بنا ہی گئی جس کو چھو گئی
جب تو کسی قفس کے کبھی رو برو گئی
بلبل تڑپ تڑپ گئی بے تاب ہو گئی

تیرے نفس سے آئی جو بوئے قبائے گل
بلبل غریب چیخ اٹھی "ہائے ہائے گل"!

تاروں کی چھاؤں میں جو تو آتی ہے باغ میں
ٹھنڈک سی ڈال دیتی ہے لالے کے داغ میں
خوبانِ صحنِ باغ کی بزمِ فراغ میں

بھرتی مئے نشاط ہے گُل کے ایاغ میں

تجھ کو سمجھ کے ساقی سرشار، اے نسیم!

مستانہ جھوم جاتے ہیں اشجار، اے نسیم!

گاتے ہیں طائرانِ چمن تیرے ساز پر

رقصاں ہے سبزہ جن کی نواہائے راز پر

اور گوشِ گُل ہے وا، ترے راز و نیاز پر

نرگس کی چشمکیں ہیں اداہائے ناز پر

آ کر طلسمِ خوابِ چمن توڑتی ہے تُو!

مُہرِ سکوتِ صبر شکن توڑتی ہے تُو!

نکلی چمن سے سُنبل و ریحاں کو چھیڑتی

بالائے بام کاکُلِ خُوباں کو چھیڑتی

بن میں چراغِ گورِ غریباں کو چھیڑتی

عاشق کے شعلۂ دلِ سوزاں کو چھیڑتی

رم کر کے دم زدن میں کہیں سے کہیں گئی

بحر و جبل کو پھاندتی گردِ زمیں گئی!

جب پرتوِ سحر سے ہو روشن طبق طبق

اور رنگِ گل سے صحنِ گلستاں شفق شفق

دفتر ہو عیش کا گلِ تر کا ورق ورق

ہو بے حجابیوں سے تری گل عرق عرق

تو کشتگانِ ہجر کو چھیڑے نہ اے نسیم!

زخمِ کہن کے بخیے اُدھیڑے نہ اے نسیم!

⟶ ✣ ⟵
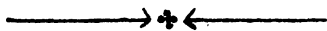
فصلِ بہار

مژدہ اے دیدۂ تماشائی! حسنِ فطرت ہے وقفِ برنائی

صحنِ گلشن میں پھر نظر آئی غنچہ و گُل کی محفل آرائی

پیکرِ ناز بُوٹا بُوٹا ہے

حُسن کیا کیا زمیں سے پھُوٹا ہے!

نہیں نرگس پہ خواب کی مستی بلکہ ہے یہ شباب کی مستی

واہ بُوئے گلاب کی مستی ہے ہوا میں شراب کی مستی!

ذوقِ مستی کے اے تمنّائی!

بادہ نوشی ہے بادپیمائی

خندۂ صبح ہے بہار آمیز جلوۂ شام ہے نشاط انگیز

شب کو مہتاب ہے تبسّم ریز　　　جس سے بحرِ جنوں ہو طوفاں خیز

اُف! یہ لیل و نہار کا عالم

اور اُس پر بہار کا عالم!

جوشِ گُل سے جہاں ہُوا رنگیں　　　دامنِ چرخ جا بجا رنگیں

دشت و صحرا کی ہے فضا رنگیں　　　نغمۂ مُرغِ خوشنوا رنگیں

ہیں یہ رنگِ بہار کے جلوے

صنعتِ کردگار کے جلوے!

یہ دمِ صبح عطر بار نسیم　　　نفسِ شاھدِ بہار نسیم

سحر پرور، فسوں شعار نسیم　　　گل و بلبل کی راز دار نسیم

اس سے ٹھنڈا جگر کسی کا ہے

اور دل آگ پر کسی کا ہے!

حُسن اسی فصل میں نکھرتا ہے　　　عشق اسی دور میں اُبھرتا ہے

صورتِ گل کوئی سنوارتا ہے پیرہن کوئی چاک کرتا ہے

کر ہی دیتی ہے آہ! بوئے بہار
آرزوہائے خفتہ کو بیدار!

آمدِ گل کا ہم کو کیا احساس دل ہی پہلو میں کب سے کشتۂ یاس
یہ جو نالے ہیں زینتِ قرطاس ہے فقط اپنی شاعری کا پاس

ورنہ ہم کو خزاں بہار ہے ایک
برگِ گل اور نوکِ خار ہے ایک!
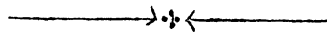
تصویرِ بہار

دامنِ کوہسار سے ساحلِ رودبار تک
ساحلِ رودبار سے دامنِ کوہسار تک!

مسندِ شاہدِ بہار — تختۂ سبزہ زار ہے!

شبنم تر سے کشت زار — تختِ گہر نگار ہے!

منظرِ جلوۂ طرب — ساحتِ روزگار ہے!

رُوح نواز کس قدر — نغمۂ آبشار ہے!

منظرِ صافِ سطحِ آب — آئنۂ بہار ہے!

دشت میں الغرض عیاں — قدرتِ کردگار ہے!

دامنِ کوہسار سے — ساحلِ رودبار تک

ساحلِ رودبار سے — دامنِ کوہسار تک!

شاخ بہ شاخ سُو بہ سُو — نغمہ سرا طیور ہیں!

گرم ہے محفلِ نشاط — بادہ کشِ سرور ہیں!

جو سمنے ہیں شجر تمام — مست نشے میں چُور ہیں!

رقصِ شعاعِ مہر کے — جلوے قریب دُور ہیں!

ذرّے تمام خاک کے رُوکشِ کوہِ طور ہیں!

قدرتِ صانعِ ازل سب یہ ترے ظہور ہیں!

دامنِ کوہسار سے ساحلِ رود بار تک

ساحلِ رود بار سے دامنِ کوہسار تک!

ابرِ بہار
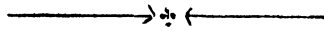
ابرِ نیساں ہے سحابِ فیض کہلاتا ہے تُو

مستِ صہبائے کرم ہے جُھومتا آتا ہے تُو

خوشنما دوشِ ہوا پر ہے ترا تختِ رواں

اُس کی کیا توصیف ہو جس شان سے آتا ہے تُو

جب زمینِ خشک پھیلاتی ہے دامانِ سوال
رحمتِ باری کے موتی اس پہ برساتا ہے تُو

ہوتی ہیں جب وقفِ عُریانی عروسانِ چمن
خوب صورت سبز جوڑے اُن کو پہناتا ہے تُو

بے بسی میں اُٹھتے ہیں شاخوں کے جب دستِ دُعا
دستگیر اُن بے کسوں کا بن کے آجاتا ہے تُو

کبھی دیتا ہے تجھے دردِ اخوّت اشکِ آب
ساحلِ دریا کو جب تفسیدہ لب پاتا ہے تُو

تازگی پاتے ہیں تیرے نام سے اہلِ زمیں
آسمانوں سے پیامِ زندگی لاتا ہے تُو

رونقِ گلزارِ ہستی کو بڑھانے کے لئے
باغ میں پھولوں کے میلے آ کے لگواتا ہے تُو

گُل بداماں ایک چھینٹے سے ہوئے دشت و جبل

آسماں سے حُسن برساتا ہُوا آتا ہے تُو

آہ! اشتیاقِ ترنّم کس قدر ہے یہ ترا

سبزۂ خوابیدہ چونک اُٹھتا ہے جب گاتا ہے تُو

جلوۂ رخسارِ گل کو آتشیں کرتا ہُوا

آتشِ اُلفت دلِ بلبل میں بھڑکاتا ہے تُو

عارضِ خوباں میں رنگ روئے گل بھرتا ہُوا!

مثلِ بُلبل عاشقوں کے دل کو تڑپاتا ہے۔

یاد آجاتے ہیں وہ دن جو نہ آئیں گے کبھی،

نالہ کش محروم ہو جاتا ہے جب آتا ہے تُو!

→ ✤ ←

بادِ بہاری چلی

(۱)

گلشنِ آفاق میں پھول کھِلاتی ہوئی
ناچتی گاتی ہوئی
جلوۂ فردوس کا رنگ جماتی ہوئی
عطر اُڑاتی ہوئی
بادِ بہاری چلی!

(۲)

سبزہ و گلزار کو کرتی ہوئی شادکام
بھرتی مسرّت کے جام

دہر کو دیتی ہوئی دَورِ طرب کا پیام

ہنستی ہنساتی ہوئی

بادِ بہاری چلی !

(۳)

غنچے جو لب بستہ تھے اُن کو ہنساتی ہوئی

پھول کھلاتی ہوئی!

سبزہ جو خوابیدہ تھا اُس کو جگاتی ہوئی

شور مچاتی ہوئی

بادِ بہاری چلی !

(۴)

دَورِ زمستاں میں تھے ولولے جن کے خموش

اب ہیں وہ محوِ خروش

زمزمہ پیرائی کا   بھرتی ہوئی ان میں جوش

وجد میں لاتی ہوئی

بادِ بہاری چلی!

(۵)

صحنِ چمن سے چلی   چھیڑتی اشجار کو

برگ و گل و خار کو!

وصل کے ایّام کا   بلبلِ بیمار کو

مژدہ سناتی ہوئی

بادِ بہاری چلی!

(۶)

رنگ بدلتی ہوئی   حسنِ فسوں بار کے

عشوۂ دلدار کے

ڈھنگ بدلتی ہوئی عشقِ جنوں کار کے

جوش بڑھاتی ہوئی

بادِ بہاری چلی!

(۷)

اگلی بہاروں کے دن یاد دلاتی ہوئی

صبر اُڑاتی ہوئی

پھر دلِ افسردہ میں آگ لگاتی ہوئی

درد اُٹھاتی ہوئی

بادِ بہاری چلی!

(۸)

خاطرِ محروم کو دیتی ہوئی اضطراب

کشمکش و پیچ و تاب

صبر کو آرام کو کرتی ہوئی وقفِ خواب

فتنے اُٹھاتی ہوئی

بادِ بہاری چلی!

ترانۂ بسنت

نمبر ۱

سردی گئی بسنت کے ایام آ گئے
طائر نویدِ فصلِ بہاراں سنا گئے!
ظاہر ہوئے وہ پیش روانِ جلوسِ گل
سرسوں کے زرد پھول نگاہوں کو بھا گئے

چشمے سرک کے دامنِ کہسار سے پہ چلے
مشقِ خرامِ ناز کے پھر دَور آ گئے!
کیفیتیں کچھ اور ہیں لیل و نہار کی
جن میں فسردگی تھی وہ صبح و مسا گئے
صحنِ چمن میں سبزۂ خوابیدہ جاگ اُٹھا
انوارِ صبحِ موسمِ دلکش جگا گئے
اشجار جی اُٹھے ہیں، کہ جھونکے نسیم کے
اعجازِ عیسوی کے کرشمے دکھا گئے
سرما کے جَور سے جو تھے منقار زیر پر
اب اُن کے نغمے تا سرِ فوق السما گئے
عالم نہ پُوچھ چاندنی راتوں کے لُطف کا
یہ جلوے بجلیاں دل و دیں پر گرا گئے!

کیا ہے کلورکوٹ میں محرّوم لطفِ زیست
صحرا میں دن بہار کے کیا آئے کیا گئے!
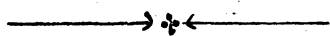
ترانۂ بسنت

نمبر۲

(۱)

پھر گلشنِ عالم میں
پیغامِ بسنت آیا!

پھر گونجتے ہیں نغمے مسرور فضاؤں میں
اک کیف کا عالم ہے صحرا کی ہواؤں میں

رعنائیِ دلکش ہے　　پھولوں کی اداؤں میں

بیتابیٔ اُلفت ہے　　بلبل کی نواؤں میں

بُلبل کی نواؤں نے

ہر ذرّے کو تڑپایا!

(۲)

رخصت ہوئی دنیا سے

افسردگیٔ سرما!

پھر تازگی و تیزی　　سورج کی چمک میں ہے

اِک شانِ دل آویزی　　شبنم کی دمک میں ہے

پھر ولولہ انگیزی　　پھولوں کی مہک میں ہے

اندازِ جنوں خیزی　　بُلبل کی چہک میں ہے

پھر گلشنِ عالم میں
ہنگامہ ہُوا برپا!

(۳)

ہنگامہ ہُوا برپا!
فطرت میں مچی ہلچل!

یخ بستہ جو دریا تھے — پھر ہو گئے وہ جاری
پھر سبزۂ خوابیدہ — ہے مائل بیداری
پھولی ہوئی سرسوں سے — کھیتوں میں ہے زرکاری
شبنم کی گہر پاشی — سورج کی ضیا باری

ہر شاخِ چمن رقصاں
ہر برگِ شجر بے کل!

پھر بسنت آیا

صبا نے مژدہ سُنایا کہ پھر بسنت آیا
گُلوں نے جلوہ دکھایا کہ پھر بسنت آیا

کلی کلی نے چٹک کر "خوش آمدید" کہا
یہ کس نے اُن کو بتایا کہ پھر بسنت آیا

طیورِ زمزمہ پرداز نے برنگِ دگر
چمن میں جشن منایا کہ پھر بسنت آیا

نکھرتا جاتا ہے پھر حُسنِ شاہدِ فطرت
پلٹتی جاتی ہے کایا کہ پھر بسنت آیا

چمن کو وادی و صحرا کو دستِ قدرت نے

بہ ذوق و شوق سجایا کہ پھر بسنت آیا

سحابِ فیض نے سبزے کی نرم اطلس کا

زمیں پہ فرش بچھایا کہ پھر بسنت آیا

پلٹ کے نیّرِ اعظم سوئے شمال آیا

سمٹ کے رہ گیا سایا کہ پھر بسنت آیا

زمیں نے سرسوں جمائی ہے کیا ہتیلی پر

کرشمہ خوب دکھایا کہ پھر بسنت آیا

رہا فسردہ و پژمردہ کیوں دلِ محروم

اُسے یقین نہ آیا کہ پھر بسنت آیا !

——————>•<——————

پنجاب کے میدان

کس قدر ہے آہ! دامنگیرِ دل تیری زمیں
دلکشی پنجاب! کتنی تیرے میدانوں میں ہے
تیری وسعت میں ہوئی گم رفعتِ چرخِ بریں
ایک ایوانِ فلک بھی تیرے ایوانوں میں ہے!

دُور تک آتی نظر ہیں لہلہاتی کھیتیاں
سامنے جن کے خجل ہے کشتِ خضرائے فلک!
اور چاندی کی چمک والی یہ تیری ندیاں
کہکشاں ایسی اگر رکھتا ہے دکھلائے فلک!

دیدہ و دل جس سے روشن آریاؤں کے ہوئے
آج بھی تیری فضاؤں میں جھلکتا ہے وہ نُور
نغمۂ مستانۂ توحید کی تاثیر سے
آج بھی تیری ہواؤں سے ٹپکتا ہے سرُور

عاشقی پرور سماں تیری چراگاہوں میں ہے
یاد جس سے تازہ ہے رانجھے کی اور مہینوال کی
اور غُبار ریں سا جو منظر وحشت کی راہوں میں ہے
خاک اُڑتی ہے یہ عُشّاقِ پریشاں حال کی

دل تڑپ اُٹھتا ہے پہلو میں یکایک جب کہیں
بانسری کی کُوک اُٹھتی ہے سکوتِ شام میں

مائلِ فریاد ہوتا ہے دلِ اندوہ گیں
اور دل سے ہوک اٹھتی ہے سکوتِ شام میں!

کچھ خیاباں بہرِ گلگشتِ بتانِ نازنیں
کچھ بیاباں دشت پیمایانِ وحشت کے لئے
بلبل و گل کی ہے خلوت گاہ تیری گل زمیں
بزمِ زیبا اختلاطِ حسن و الفت کے لئے

حسن و الفت ہی نہیں ہے تیری شانِ امتیاز
کونسا میداں ترا ہے جو نہیں میدانِ جنگ
جذبۂ حُبِّ وطن پر خاک کو تیری ہے ناز
سورماؤں کے لہو سے آج تک ہے لالہ رنگ!

شملہ

رشکِ فردوس ہے محرومِ فضا شملے کی
نفَسِ حور سے بڑھ کر ہے ہوا شملے کی!

چہرۂ شاہدِ فطرت نہیں مستور یہاں
نہیں اے ذوقِ نظر پردے کا دستور یہاں

راجہ اندر کا اکھاڑہ ہے یہ کہسار نہیں
سبز پریوں کے ہیں انبوہ، یہ اشجار نہیں

اس کی رفعت کا بھلا کس سے ہو اندازہ ٹھیک
ہوں گی جنّت کی فضائیں کہیں اس کے نزدیک

نگہِ شوق جدھر اُٹھ کے چلی جاتی ہے
مخملی فرش بچھا زیرِ قدم پاتی ہے

کیا خبر کیسا ہو نیرنگِ تماشائے بہار
کہ خزاں میں ہے یہاں منظرِ زیبائے بہار

چشمِ مشتاق کو سامانِ تماشا ہیں بہم
شجر و سبزہ و گل انجمن آرا ہیں بہم

بے تکلف ہے یہاں عشوۂ عریانِ بہار
خلوتِ ناز ہے یہ بزمِ عروسانِ بہار

حیرت افزا ہیں بہت چیل کے اشجارِ بلند
ان کی توصیف کو درکار ہیں افکارِ بلند!

کوئی دیکھے تو ذرا ان کی فلک فرسائی
بے ستوں کیا ہے یہ سقفِ فلکِ مینائی!

تازگی جلوۂ انوارِ سحر میں ہے یہاں
طفلِ معصوم اٹھے خواب سے جیسے خنداں!

منظرِ شام نیا لطف دکھا دیتا ہے

سایۂ زلفِ حسیناں کا پتا دیتا ہے!

قمقمے دامنِ کہسار سے تا دامنِ چرخ

جن کی طلعت سے ہے ممنونِ ضیا دامنِ چرخ

نظر آتے ہیں ستاروں سے زیادہ روشن

روبرو ان کے ستارے ہیں دیئے بے روغن

سامنے ان کے نہ کیوں ماند ہوں سارے تارے

ٹکڑے بجلی کے ہیں یہ اور وہ بچارے تارے

جس طرف دیکھئے اِک نُور نظر آتا ہے

جو شجر ہے شجرِ طور نظر آتا ہے!

سبق آموز ہے کیا خوب یہاں کی بستی

ہر بلندی کی بغل میں ہے برابر پستی

دھوپ چھاؤں کے مناظر بھی غضب ڈھاتے ہیں
رنگ نیرنگیٔ دوراں کا دکھا جاتے ہیں!
سایۂ ابر کہیں جلوۂ خورشید کہیں
عالمِ یاس کہیں پرتوِ اُمّید کہیں!
سایہ و نُور کا باہم یہ بدل کر چلنا
یاس و اُمّید کے جادو کا ہے یکسر چلنا
پھر کبھی شملے کی تعریف میں لکھیں گے کچھ اور
اب تو بدلا ہے خیالات نے پہلو بے طور!

راماین
کے
سین

عزمِ صحرا

یعنی

شری رامچندر جی کی بن کو تیاری اور اہلِ اجودھیا کی بیقراری

رخصت اجودھیا سے وہ جانِ جہاں ہوا
یا اتفاقِ تفرقۂ جسم و جاں ہوا
پہلو سے دل گیا، کہ چلا رام شہر سے
بھاگے نکل کے راحت و آرام شہر سے

گویا بہار چھوڑ کے صحنِ چمن چلی!
پر وہ بھی اس طرح نہ کبھی دفعتہً چلی!
آنکھوں سے چہرہ رام کا جب دُور ہو گیا
بلدہ تمام دیدۂ بے نُور ہو گیا!

غم کا غبار لے کے جو آہِ رسا گئی
کالی گھٹا سی چرخ پہ گھنگور چھا گئی!
آہوں میں جو شرار دلوں سے نکل گئے
وہ آسماں پہ برق بنے اور مچل گئے

عالم وہ بجلیوں پہ غضب اضطراب کا
ہائے وہ جوشِ گریۂ پیہم سحاب کا
انساں تو خیر صدمۂ غم سے نڈھال تھے
وحش و طیُور تک بھی اسیرِ ملال تھے

بیگانہ طرزِ رقص سے باغوں میں مور تھے
غم سے پروں میں گردنیں ڈالے چکور تھے
رگھبر چلے کہ شہرِ خموشاں اودھ ہوا
آباد دشت ہوگیا، ویراں اودھ ہوا!

صحرا کو رام و لچھمن و سیتا جو چل پڑے
بیتاب ہوکے لوگ گھروں سے نکل پڑے
زار و قطار روتے ہوئے بے قرار سب
تھے پیچھے پیچھے رام کے باحالِ زار سب

ہر اہلِ شہر خستہ و زار و نژند تھا
ہر گھر سے شورِ نالہ و شیون بلند تھا
تھا ارد گرد رتھ کے وہ خلقت کا اژدہام
گھوڑوں کو گام گام پہ لیتے تھے تھام تھام

کہتے تھے "مر ہی جائیں گے اے پران ناتھ ہم

ہم کو نہ چھوڑ جایئے۔ جائیں گے ساتھ ہم"

یہ حال دیکھ کر وہ عزیزِ دلِ انام

گویا ہوا کہ "اہلِ اجودھیا سنو تمام

جاتا ہوں بن کو میں کہ یہ فرماں ہے باپ کا

پہنچانے آپ آئے ہیں احساں ہے آپ کا

بہلاؤ جا کے دل شہِ پیرانہ سال کا

کم تا کہ اُن کے دل پہ ہو صدمہ ملال کا

تشویش کیا تمہیں کہ بھرت تاجدار ہے

عالم ہے، رحم دل ہے، صداقت شعار ہے

ہے تم پہ فرض اُس کی اطاعت بجان و دل

کرتا ہے جب وہ تم سے محبّت بجان و دل

ہوگی اُسے تمہاری اطاعت سے تقویت

پاتے ہیں شہریار رعیت سے تقویت

پرماتما کے شکر کرو شادماں رہو!

سرزیرِ منّتِ شہِ امن و اماں رہو!

اور میری واپسی کا جو تم کو خیال ہے

یہ ہے خیالِ خام! یہ امرِ محال ہے"

یہ کہہ کے سارتھی سے اشارہ کیا کہ "ہاں

لگتی ہے دل پہ چوٹ سی سُن سُن کے زاریاں

بہتر ہے اس ہجوم سے رتھ کو نکال کے

گرمِ سفر ہو دشت کے رستے پہ ڈال کے"

چلنے سے رتھ کے اور قیامت بپا ہوئی

یعنی بلند شورشِ آہ و بکا ہوئی

رکھے ہوئے جگر پہ، کلیجے پہ ہاتھ سب

روتے ہوئے روانہ ہوئے رتھ کے ساتھ سب

جو تھے جواں وہ گھیر کے رتھ کو رواں ہوئے

جو ناتواں ضعیف تھے پیچھے رواں ہوئے

کہتے ہوئے کہ "اتنے تو ہم سے خفا ہو رام

صحرا نوردِ صورتِ موجِ صبا ہو رام!

یوں تیز تیز کس لئے رتھ کو اڑا چلے

بوڑھوں کو گردِ راہ میں رگھبر! ملا چلے

لیکن رہے خیال کہ مرنے کے ہم نہیں

یہ زیست ہم کو موت سے اے رام کم نہیں

ہم سر کے بل چلیں گے اگر پاؤں ٹوٹ جائیں
بل جائے کاش موت اگر تجھ سے چھوٹ جائیں
حیرت ہے! آج قفلِ دہن کھولتے نہیں
مُہرِ سکوت لب پہ ہے کچھ بولتے نہیں
سُنتے نہیں ہو آج برہمن کی التماس
تکریم کا خیال کدھر ہے؟ کہاں ہے پاس؟
اے رام! کیا ہوئیں وہ ترے دل کی نرمیاں
کیوں سرد پڑ گئیں وہ محبت کی گرمیاں؟
بیٹھے تھے ہم تو جشن کا ساماں کئے ہوئے
جاتے ہیں آپ عزمِ بیاباں کئے ہوئے
واپس اودھ کو جائیں تو کس مُنہ سے جائیں ہم!
اپنا اودھ وہی ہے جہاں تجھ کو پائیں ہم!

وُہ پھُول تُو ہے جس کی پھبن سے سماں رہا
لطفِ بہارِ شامِ اودھ اب کہاں رہا!
جنگل اجودھیا ہے تو صحرا دکیکئی!
کچھ بے طرح ہے مائِل بیداد کیکئی:
یہ آگ سب اُسی کی لگائی ہوئی تو ہے
خلقت تمام اُسی کی ستائی ہوئی تو ہے!
جسرتھ کا حال غیر، کوشلیا کا حال غیر
تیرے بغیر ساری اجودھیا کا حال غیر!
یُوں گرتے، اُٹھتے، بیٹھتے روتے ہوئے تمام
ساعی رہے غریب پئے واپسئ رام!
ہرچند اپنے جی کو کیا رام نے کڑا
لیکن وہ تھا ہجوم کہ رتھ روکنا پڑا!

ٹھہرا جو رتھ تو دل میں وہ سب ہو کے شاد شاد
کہنے لگے کہ دل کی بر آئی ہے اب مُراد
رتھ سے اُتر کے رام جو پیدل رواں ہوئے
پھر لوگ محوِ گریہ و آہ و فغاں ہوئے
دورِ اُفق پہ گرنے لگے پردہ ہائے شام
تمسا ندی پہ رام نے آکر کیا قیام
سب کو سُلا کے سو گئے ساحل پہ آپ بھی
سوتے ہوئے رہائی کی تجویز سوچ لی
اہلِ اجودھیا تھکے ماندے تھے سو گئے
قدموں میں آکے رام کے بےفکر ہو گئے
از بس کہ دوڑ دھوپ سے دن بھر کی چُور تھے
سونا ضرور تھا اُنہیں، غافل ضرور تھے!

رگھبر بہت سی رات رہے اُٹھ کھڑے ہوئے

جس وقت اہلِ شہر تھے غافل پڑے ہوئے

راہی ہوئے وہ لے کے اجازت سومنت سے

اور ساتھ ہی کہا یہ بمنّت سومنت سے

لے جاؤ رتھ ادودھ کو مگر ہیر پھیر سے

"تا اہلِ شہر کو نہ مرا کچھ پتا چلے"

پَو پھٹتے پھٹتے تینوں وہ دریا کے پار تھے

تلوے تھے آہ پھول سے اور خار زار تھے!

مایا کا ہرن مار کے جب رام اِدھر آیا
کٹیا میں نہ سیتا کا نشاں تک نظر آیا
باہر بہ دلِ خُوں شدہ و چشمِ تر آیا
ہر اشک لئے حالتِ دل کی خبر آیا
نظروں سے وہ خورشید سا چہرہ جو نہاں تھا
آنکھیں جدھر اُٹھتیں، شبِ تیرہ کا سماں تھا
جی تھام کے، باہر در و دیوار کے ڈھونڈا
اور دونو طرف پہلوئے کہسار کے ڈھونڈا

اُس گُل کو ہر اک برگ میں گلزار کے ڈھونڈا
ہر ڈال میں، ہر پات میں اشجار کے ڈھونڈا
اُس سرو رواں نے جو کہیں سر نہ نکالا
حسرت سے گرا خاک میں بس ڈھونڈھنے والا

اُمّید کا اب دل کو سہارا نہیں باقی
اور سعی کا، تدبیر کا یارا نہیں باقی
دل بیٹھ گیا، کوئی اُبھارا نہیں باقی
آنکھوں کے لئے ذوقِ نظارا نہیں باقی

لچھمن سے کہا بھائی! مصیبت یہ کڑی ہے
حیرت میں ہوں کیوں جانِ حزیں لب پہ اڑی ہے

شانز - سیاہی - کہسار میں وہ آشنہ سیما نہیں ملتا
صحرا میں کہیں نقشِ کفِ پا نہیں ملتا

گلزار میں اپنا گلِ رعنا نہیں ملتا
دریا میں بھی وہ گوہرِ یکتا نہیں ملتا

پہلے ہی تھا ویرانے میں کاشانہ ہمارا
اب اور بھی ویراں ہُوا ویرانہ ہمارا

کُٹیا تھی اگر جسم تو جاں اُس میں تھی سیتا
تھی صفتِ روحِ رواں اُس میں تھی سیتا

ہر شام و سحر جلوہ فشاں اُس میں تھی سیتا
جب میں ہُوا صحرا کو رواں اُس میں تھی سیتا

مقدور یہاں کس کا، زمیں کھا گئی اُس کو
یا تیری نظر، چرخِ بریں! کھا گئی اُس کو

اشجار بھی مجھے اُس کا پتا کیوں نہیں دیتے
پتّوں کی زباں ہے تو صدا کیوں نہیں دیتے

مرغانِ ہُوا اتم ہی بتا کیوں نہیں دیتے

سیتا پہ جو گزری ہے سُنا کیوں نہیں دیتے

بھرتا نہیں دم کوئی بھی فریاد رسی کا

سچ ہے کہ نہیں کوئی مصیبت میں کسی کا!

سُنبل سے جو قدرت نے لئے گیسوئے سیتا

پھُولوں سے لیا روغن و رنگِ روئے سیتا

قوسِ قزحِ چرخ سے تھے ابروئے سیتا

غنچوں سے دہن نکہتِ گل سے بوئے سیتا

اور نرگس پر سحر اُڑائی تھی ہرن سے

لب لعل سے اور دانت لئے دُرِّ عدن سے

صنعت گرِ بیچوں نے سراپا یہ بنایا

چُن چُن کے ہر اک عنصرِ چیدہ کو کھپایا

وہ پیکرِ دلکش مری آنکھوں میں سمایا
لیکن مرے برگشتہ مقدر کو نہ بھایا
مجموعۂ خوبی کو پریشان کیا آخر
غربت میں مجھے کشتۂ حرماں کیا آخر!

واپس دئے اجزائے رُخ و زلف چمن کو
قد سرو کو۔ خوشبو ملی ریحان دمن کو
لب سوئے بدخشاں گئے اور دانت عدن کو
پھر دیدۂ سیتا کا ملا سحر ہرن کو

یوں درہم و برہم ہوئی وہ ناز کی پُتلی،
بن آئے گی پھر کس سے اس انداز کی پُتلی!

سیتاجی کی فریاد

تیر سے ترکش میں ابھی تک او کمانداِرِ قضا!
تیر باقی تھا کوئی مجھ پر چلانے کے لئے؟
کم تھی وہ صحرا نوردی؟ کم تھے وہ راون کے جور؟
آہ! یہ ایام بھی باقی تھے آنے کے لئے؟
وہ زمانہ جا لگا جب ہر گلِ باغِ اشوک
شعلۂ نارِ عقوبت تھا جلانے کے لئے
آہ! تھے اس قید میں ساماں جہنّم کے تمام
تھی مگر اُمّید دل کو گدگدانے کے لئے

روکنا جاں کو نکلنے سے کہ آئیں گے ضرور
دل سے یوں کہنا کہ ہیں تیار آنے کے لئے

ہائے! میں مجبور اب کس پر رکھوں چشمِ اُمید
جب ہوئے آمادہ وہ آنکھیں چُرانے کے لئے

آنسوؤں کے نہر کیوں جاری ہیں لچھمن سچ بتا
تُو تو کہتا تھا "چلو گنگا نہانے کے لئے"

کاش! گنگا، تو ہمیشہ کے لئے لے لے مجھے
یُوں اگر بیتاب تھی میرے بُلانے کے لئے

آرزو رشیوں کے درشن کی بھی تھی بیشک مجھے
پر نہ تھی تیار اس حالت میں آنے کے لئے

کیا کہوں گی؟ کیوں ہوئی آوارۂ دشتِ بلا
تنگ ہوں اب آہ! اُن کے آستانے کے لئے

داغِ رسوائی جو قرضیٔ دامن سیتا پہ ہے
مٹ ہی جاؤں کاش میں اس کے مٹانے کے لئے

ہائے! وہ دل کس طرح مجھ سے مکدّر ہو گیا
جو دلِ صافی تھا آئینہ زمانے کے لئے

جاننے والے ہیں وہ اسرار کے اوّل تو پھر
آتشِ سوزاں تھی کافی آزمانے کے لئے

رام کی خاطر زمانے بھر کو چھوڑا تھا، مگر
آہ! مجھ کو رام نے چھوڑا زمانے کے لئے

لب پہ شکوہ رام کا آئے تو کٹ جائے زباں
مجھ کو پیدا ہی کیا صدمے اٹھانے کے لئے

بدگماں ہو رام مجھ سے، یہ تو ممکن ہی نہ تھا
کس طرح آتا جو کچھ تھا پیش آنے کے لئے

مَیں نہ چھوڑوں گی نہ چھوڑوں گی خیالِ رام کو
گو مچلتا ہی رہے دامن چھُڑانے کے لئے!

آہ! اے صحرا کے پھُولو! کس لئے ہنستے ہو تُم؟
کس لئے ہنستے ہو تم! کس کو ہنسانے کیلئے؟

تُم نہ تھے، وہ روئے خنداں رام کا تھا اے گلو
اب ہنسو گے تُم کسی کو خوں رُلانے کے لئے

اب نہ سیتا کی وہ آنکھیں ہیں نہ وہ سیتا کا دل
دل ہی خوں ہونے کو، آنکھیں خُوں بہانے کے لئے

لُطفِ گلگشتِ چمن صحرا میں تھا ہمراہِ رام
سبزہ زارو! آ گئی ہوں اب خاک اُڑانے کے لئے

آہ اے بادِ صبا! اٹھکھیلیوں کے دن گئے
اب چلے گی تُو کسی کی خاک اُڑانے کے لئے

دل بڑھے گا کس کا اب کالی گھٹا کو دیکھ کر
آئے گی تو آئے گی بجلی گرانے کے لئے

دھرتی ماتا! کھول دے آغوشِ اُلفت کھول دے
ساری دُنیا اب ہے مجھ کو کاٹ کھانے کے لئے

ہیں کہاں اے آسماں تیرے وہ اندازِ ستم
ٹوٹ پڑ طرزِ جفا کو آزمانے کے لئے

پوچھتی پھرتی ہوں تیرے گھر کو مرگِ ناگہاں
مضطرب ہے آہ! جانِ زار جانے کے لئے!

—→✱←—

اعجازِ عصمت

کہاں جنگل وہ کانٹوں کے کہاں رشکِ چمن سیتا

کہاں رستے پہاڑوں کے کہاں نازک بدن سیتا

کہاں تپتے ہوئے صحرا، کہاں برگِ سمن سیتا

کہاں وہ بالشِ خارا، کہاں گل پیرہن سیتا

کہاں سے ان مصائب کے اٹھانے کا جگر پایا

"پتی برت دھرم" کی طاقت نے یہ اعجاز دکھلایا

کہاں سیتا مہارانی، کہاں وہ قید راون کی

وہ فرقت رام کی، وہ دھمکیاں عصمت کے دشمن کی

وہ ننھا سا کلیجا، وہ ڈراؤنی صورتیں بن کی

وہ تدبیریں نئی ایذائے جان و کاہشِ تن کی!

مگر آخر مقدر خود کئے پر اپنے پچھتایا
"پتی برت دھرم" کی طاقت نے یہ اعجاز دکھلایا

اِدھر تھے دو مسافر، بے سروسامان اور تنہا
اُدھر راون بصد شاہانہ شوکت جلوہ فرما تھا
سمندر بیچ میں حائل، نہ آر اُس کا نہ پار اُس کا
جلا دی کس طرح بن باسیوں نے پاپ کی لنکا
یہ کس کی آہ نے راون کو خاک و خوں میں تڑپایا
"پتی برت دھرم" کی طاقت نے یہ اعجاز دکھلایا

نکل کر کوکبِ اُمّید کا پھر وہ نہاں ہونا
نئے بن باس کے صدمے، وہ پھر بے خانماں ہونا
سُبک تھا کوہِ غم جن سے، وہ اُن کا سر گراں ہونا
دوبارہ بختِ بد کا درپئے آزارِ جاں ہونا

کہاں سے ان مصائب کے اُٹھانے کا جگر پایا
"پتی برت دھرم" کی طاقت نے یہ اعجاز دکھلایا

زمانہ ایک جنگل میں یونہی با چشم نم گزرا
شبِ فریاد آئی آہ! جب روزِ الم گزرا
خبر دے کہ گیا وہ آمدِ غم کی جو دم گزرا
ہوئی بیتاب سینا سر سے جب طوفانِ غم گزرا

زمیں شق ہو گئی فریاد سے، اِک زلزلہ آیا
"پتی برت دھرم" کی طاقت نے یہ اعجاز دکھلایا
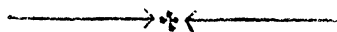
راون کا ماتم

بیٹھا جگر میں رام کا تیرِ فنا پیام
راون کی ہست و بود کا قصّہ ہُوا تمام

افواجِ رام میں پڑی کوسِ ظفر پہ چوٹ
جس سے کہ کھائی راکھشسوں نے جگر پہ چوٹ

نصرت نے نذرِ رام کیا تاجِ افتخار
غلطاں بخون وخاک تھا لنکا کا تاجدار

رنواس میں تھیں چشم براہ رانیاں تمام
اِک انتظار میں ہوئی آخر سحر سے شام

راون کے حشر کی جو حرم میں خبر گئی
برچھی تھی اک کہ چاک کلیجوں کو کر گئی

ہاتھوں میں تھام کر جگر پاش پاش کو
سب دیکھنے نکل پڑیں راون کی لاش کو
جمگھٹ وہ رانیوں کا جو ماتم کناں چلا
فریاد و آہ و نالہ کا اِک کارواں چلا
وہ دِل جلوں کے نالے، وہ ماتم سُہاگ کا
تھا سوزِ دل سے ہر نَفَس اک شعلہ آگ کا
کُھل کُھل کے آئے تا بہ کمر موئے عنبریں
دُھل دُھل کے اشک سے ہوئے فق روئے آتشیں
جوشِ الم میں روتی ہوئیں پھوٹ پھوٹ کے
لاشے پہ آ کے گرنے لگیں ٹوٹ ٹوٹ کے
یوں لاش پر پہنچ کے ہر اک سر کے بل گئی
گویا زمین پاؤں تلے سے نکل گئی !

بن پڑتی تھی نہ کچھ دلِ اندوہناک سے
پہلو میں اُٹھ کے درد اُٹھاتا تھا خاک سے

کہتی کوئی کہ ہائے مرا راج لُٹ گیا
"لنکا کا تخت بیٹھ گیا، تاج لُٹ گیا"

پاؤں کو چومتی کوئی ہیجانِ شوق میں
دریا بہا کے آنکھ سے طوفانِ شوق میں

بیٹھی تھی کوئی لاش کا زانو پہ سر لئے
بہرِ نثار برکفِ مژگاں گہر لئے

تن سے لپٹ کے رونے لگی خستہ جاں کوئی
ہاتھوں کو دے کے دل ہوئی محوِ فغاں کوئی

کہتی تھی بازوؤں کو کوئی تھام تھام کے
"ہم بے بلوں کا آہ! سہارا یہی تو تھے"

"اِن بازوؤں کی آہ! وہ قوّت کِدھر گئی
جن سے اُٹھے پہاڑ وہ طاقت کِدھر گئی"

"کیوں گردِنِ اجل میں حمائل ہوئے یہ ہاتھ؟
ہم سے نہ ذوقِ وصل کے سائل ہوئے یہ ہاتھ"

کہتی کوئی "یہ شعبدے بھاتے نہیں ہمیں
لو اُٹھ کے بیٹھو! موت کا آیا یقیں ہمیں!"

طاقت سے اپنی زیر جو اندر کو کر چُکا
وہ فانیوں کے تیرِ ہوائی سے مر چُکا"

مندودری کہ صاحبِ حُسن وجمال تھی
راون کی شاہ بانوئے زیبا خصال تھی

یُوں تھی وہ رانیوں کے ہجومِ کثیر میں
جیسے ہو ماہتاب نجومِ کثیر میں

سر پیٹتی تھی، روتی اور نالے کرتی تھی
لاشے کو دیکھ دیکھ کے سرد آہیں بھرتی تھی
کہتی تھی "پران ناتھ! نہ کہتی تھی آپ سے؟
پاپی کی موت پاپ ہے، باز آؤ پاپ سے
تقدیر تھی جو دشمن جانی، ہزار حیف!
میری نہ ایک آپ نے مانی، ہزار حیف!
وہ دن بھی تھے آپ سے ڈرتے تھے دیوتا
دم آپ کے جلال کا بھرتے تھے دیوتا
سرتاج آپ تاجوران جہاں کے تھے
ہمپایہ اوج رتبہ میں ہفت آسماں کے تھے
لرزے میں جس کے دم سے تھے افلاک وا دریغ
بیجس پڑا ہے اب وہ سر خاک، وا دریغ!

لُڑھکا ہُوا کہیں تنِ بیجاں ہے سر کہیں
ترکش کہیں ہے، تیر و کماں منتشر کہیں!
لنکا کے شُور بیروں کا نام و نشاں مٹا
شاہی مٹی، غرور مٹا، خانداں مٹا!
ہوتا ہے یوں ظہور خدا کے عتاب کا
چرچا رہے گا دہر میں اس انقلاب کا
تا روزِ حشر باعثِ عبرت رہیں گے ہم
آماجگاہِ تیرِ ملامت رہیں گے ہم!
ٹھنکا تھا میرا ماتھا اُسی روز آپ جب
لنکا میں لے کے آئے تھے سیتا کو با تعب
تاثیرِ آہ تھی اُسی عصمت مآب کی
بھڑکی یہ جس سے آتشِ سوزاں عذاب کی

یہ آگ وہ ہے جس سے جلے خشک تر تمام
اس کی لپٹ میں آ ہی گئے بحر و بر تمام
دھڑکا تھا جس مآل کا آخر ہوا وہی
اوّل سے جس کا ڈر تھا ہوئی انتہا وہی
جانِ گناہ تیرے فنا کا نشانہ تھی
رگھبر! تری نگاہِ غضب اک بہانہ تھی
شوہر کو روؤں آہ! کہ روؤں پسر کو میں
دل کا کروں علاج! کہ تھاموں جگر کو میں"
یہ کہتے کہتے ہو گئی بے حال وہ غریب
چکرا کے غش میں آ کے گری لاش کے قریب

پند و نصائح

آلودۂ گناہ تہِ خاک ہوگیا
یہ دل مرا نہیں ہے امانت خدا کی ہے!

پُرانا کُرتہ

کل سحر پھینک کے اِک اپنا پُرانا کُرتہ
یوں لگا سوچنے مَیں، سر بہ گریباں ہوکر
کہ یہ کُرتہ جو رہا برہیں مثالِ جوشن
دافعِ ضربتِ شمشیرِ زمستاں ہوکر
شدّتِ موسمِ سرما سے بچایا مجھ کو
کی ہے کیا خوب ہی جاں پروری بیجاں ہوکر

آج یہ کُہنہ ہؤا، مَیں نے اسے پھینک دیا
وس سے کی میں نے مُروّت بھی انساں ہو کر

شاعرانہ سی پڑی تھی مرے دل میں اُلجھن
کہ صدا روح نے دی مجھ کو یہ غرّاں ہو کر

کس تُو ہم میں ہے محروم! ذرا آنکھ تو کھول
کس لئے بیٹھا ہے غافل تُو پریشاں ہو کر

لے سبق پارچۂ کہنہ سے دانا بن کر
نہ کہ مغموم سا ہو بیٹھ تو ناداں ہو کر

یہ ترا جسم بھی کُرتے کی طرح ہے غافل
اور اس کُرتے میں ہم رہتے ہیں پنہاں ہو کر

یہ بھی اک روز اسی طرح پُرانا ہو گا
پھینک دینگے اسے اور نکلینگے عُریاں ہو کر

فانی چولے سے محبّت کو گھٹاتا جا تو
تاکہ جب چھوڑیں تو چھوڑیں اسے شاداں ہو کر

اَلدُّنیا دَارُ الغُرور

ہر شمع اپنے زعم میں یاں برقِ طُور ہے
ہر کس کہ ہی کو دعوئی ہمسریٔ کوہ نُور ہے۔
عالم میں کِبر و عُجب کا ھر سُو ظہُور ہے
دُنیا سے انکسار جو ہے یاں سے دُور ہے
ہم کو تو اس جہاں سے شکایت ضرور ہے
دُنیا ہے جس کا نام وہ دارالغرور ہے!

خُوبوں کو اپنی خوبیٔ صُورت پہ ناز ہے
مٹّی کو گوری سانولی رنگت پہ ناز ہے
ناز و ادا پہ، چشمِ پُر آفت پہ ناز ہے
تنتے ہیں قدِ رشکِ قیامت پہ ناز ہے
جو اِن کو دیکھتا ہے، وہ کہتا ضرور ہے
دُنیا ہے جس کا نام وہ دارالغرُور ہے!

شاہوں کو اپنی صولتِ شاہی پہ ہے گھمنڈ
نعمت پہ، عیش و عشرتِ شاہی پہ ہے گھمنڈ
جاہ و حشم پہ، دولتِ شاہی پہ ہے گھمنڈ
طبل و عَلَم پہ، شوکتِ شاہی پہ ہے گھمنڈ
ہر شخص اُن کو دیکھ کے کہتا ضرُور ہے
دنیا ہے جس کا نام وہ دارالغرُور ہے!

زاہد کو دیکھئے، تو الگ اس کی شان ہے

خلقِ خدا پہ طعن ہیں، طاعت کا مان ہے

حضرت کو زُہدِ خشک پہ کتنا گمان ہے

بگڑا ہُوا مزاج سرِ آسمان ہے

جو اس کے ڈھنگ دیکھ لے، کہتا ضرور ہے

دُنیا ہے جس کا نام وہ دارالغرُور ہے!

عالِم جو اپنے علم پہ پھُولا ہُوا نہیں

ہم کو تو اس جہاں میں ابھی تک ملا نہیں

جاہل پہ کون عالِم و دانا ہنسا نہیں

رونا یہ ہے کہ کوئی بھی عجز آشنا نہیں

نشّہ شرابِ علم میں ہے، اور ضرُور ہے

دُنیا ہے جس کا نام وہ دارالغرُور ہے!

اہلِ ہوس کو حرص کی وسعت کا فخر ہے
"ھل من مزید" کہنے کی عادت کا فخر ہے
قانع کو اپنے گنجِ قناعت کا فخر ہے
ہمت کا، اور غیور طبیعت کا فخر ہے
معیوب ہو نہ ہو پہ تکبر ضرور ہے
دنیا ہے جس کا نام وہ دارالغرور ہے!

محرومِ خاکسار! جہاں کا یہ حال ہے
ہو اس جہاں سے دور جو فکرِ مآل ہے
نام و نمود نے جو بچھایا یہ جال ہے
بچنا مرے خیال میں اس سے محال ہے
گر کھل سکی نہ آنکھ، تو پھنسنا ضرور ہے
دنیا ہے جس کا نام وہ دارالغرور ہے!

جگانے کی گھڑی

وقتِ سحر ہے، سونے والو!   دھیان کدھر ہے، سونے والو!
جاگو نیند کے اے متوالو!   لُطفِ سحر کو کھونے والو!
جاگ اُٹھا ہے پتّا پتّا   غفلت کیسی؟ سونا کیسا!
بادِ سحر کے جھونکے آئے   نکہتِ تر کے جھونکے آئے!
جاگو، پہلو بدل کر دیکھو   اُٹھو، آنکھیں مل کر دیکھو!

صلِّ علےٰ یہ نوُر کا عالم
ہر ذرّے پر طُور کا عالم!

تازہ نوا مُرغانِ چمن ہیں   نغمے جن کے جانِ چمن ہیں
میٹھی بولی بول رہے ہیں   اُڑنے کو پر کھول رہے ہیں

وجد میں ہیں سب آئے جاتے　　حمدِ خدا کے گیت ہیں گاتے
گلشن میں جو نہر ہے جاری　　کرتی ہے سجدۂ خالقِ باری
حمد و ثنا کے ترانے گاتی
اپنی جبیں کو ہے گھسنی جاتی
نخل کھڑے ہیں سر کو جھکائے　　دستِ دُعا شاخوں نے اُٹھائے
ذکرِ خُدا میں چمن کی زباں ہے　　خار کا ہم کو جس پہ گماں ہے
محوِ یادِ خدا ہے سبزہ　　سر بسجُود پڑا ہے سبزہ
شاخ پہ بلبل زمزمہ خواں ہے　　خاک پہ سنبل سجدہ کناں ہے
جاگو، یادِ خدا کی گھڑی ہے
وقتِ نماز، دُعا کی گھڑی ہے
شور اُٹھا ناقوس و اذاں کا　　وقت نہیں یہ خوابِ گراں کا
عابد، شیخ، برہمن جاگے　　جانبِ مسجد و مندر بھاگے

عارف، زاہد اور پُجاری　　　نیند نہیں ہے جن کو پیاری

نیند سے پیاری یادِ خدا ہے　　　یادِ خدا میں جن کو مزا ہے

محفلِ راز میں جا کر بیٹھے

دل کو جہاں سے اُٹھا کر بیٹھے

کیونکہ یہ عالم دارِ فنا ہے　　　اس میں سدا کب کوئی رہا ہے

تُو ہے مسافر اس دُنیا میں　　　جیسے راہرو اُترے سرا میں

وقتِ سحر گر راہرو سوئے　　　غفلت میں گر وقت کو کھوئے

چلنے سے ہو اگر وہ غافل　　　کھوٹی کرے گا اپنی منزل

تجھ کو بھی درپیش سفر ہے

جاگ اُٹھ! جاگ اُٹھ! وقتِ سحر ہے

گوشۂ تنہائی

دُنیا میں بہت دوڑے راحت کے تمنائی
تسکیں کی مگر صورت تجھ میں ہی نظر آئی
اے گوشۂ تنہائی!

بچّہ نہیں دل، جس کو لے جایئے میلوں میں
جُز تیرے کہاں راحت دُنیا کے جھمیلوں میں
اے گوشۂ تنہائی!

خلوت وہ تری جس میں ہنگامۂ جلوت ہے
وحدت کا تری غُنچہ اک گلشنِ کثرت ہے
اے گوشۂ تنہائی!

سب عیب و ہنر اپنے اے آئینۂ باطن
تجھ بن نظر آجائیں یہ بات کہاں ممکن
اے گوشۂ تنہائی!

ساماں ہیں بہم تجھ میں سب دل کی حضوری کے
محفل میں کہاں تیری صدمے ہیں مجبوری کے
اے گوشۂ تنہائی!

آزار سے بالا ہے گو زیرِ زمیں ہے تُو
اربابِ قناعت کو فردوسِ بریں ہے تُو
اے گوشۂ تنہائی!

جنگل میں، پہاڑوں میں تاریک گپھاؤں میں
مرغوب تریں ہے یا اشجار کی چھاؤں میں
اے گوشۂ تنہائی!

پاتے ہیں جہاں تجھ کو دُنیا میں ترے شیدا
فی الفور وہیں اُن کے دُکھ درد ہیں ناپیدا

اے گوشۂ تنہائی!

شاعر کہ مصوّر ہے فطرت کے نظاروں کا
ذرّوں میں ترے اس کو جلوہ ہے ستاروں کا

اے گوشۂ تنہائی!

طالب ہیں ترے اکثر جو علم کے طالب ہیں
تجھ سے روشن دل پر مضمون و مطالب ہیں

اے گوشۂ تنہائی!

تُو مسکنِ دلکش ہے جویائے حقیقت کا
مرکز ہے حقیقت ہیں پہنائے حقیقت کا

اے گوشۂ تنہائی!

بازارِ دو عالم میں جو جنس نہیں ملتی
حیرت ہے کہ انساں کو آکر ہے یہیں ملتی
اے گوشۂ تنہائی!

دنیا میں اگر کوئی منزل گہِ عقبےٰ ہے
وہ تیری ہی محفل ہے وہ تیرا ہی ملجا ہے
اے گوشۂ تنہائی!

ہر ایک تگ و دو کی ہے آخرِ کار، آخر
گر تجھ سے یہاں بھاگے ہے کُنجِ مزار آخر
اے گوشۂ تنہائی!

خواہاں ہے دل و جاں سے محرومِ حزیں تیرا
کاش! اس کو دلِ ناداں ہونے دے مکیں تیرا
اے گوشۂ تنہائی!

عِلم

رُباعی

بیکار ہی یاں شیوا بیانی اپنی
بیسود ہے اے طبع روانی اپنی
محروم ہی خاموش قلم ہی ساکت
خود علم سناتا ہی کہانی اپنی

بزمِ جہاں میں ساغرِ آبِ بقا ہوں میں
آزارِ مرگ کیا ہے، کہ خاکِ شفا ہوں میں
میرے ہی دم سے ہے گلِ ہستی میں رنگ و بو
ابرِ بہار ہوں میں، نسیمِ صبا ہوں میں

رونق طلسم خانۂ امکاں کی مجھ سے ہے

ہوں وہ طلسم ہوش کہ حیرت فزا ہوں میں

وہ میری کہنگی ہے، فدا جس پہ تازگی

دورِ قدیم سے ہوں، مگر نت نیا ہوں میں

سب شوخیاں ہیں عالمِ ایجاد میں مری

میرے ہیں سب کرشمے، جدھر دیکھتا ہوں میں

سب جانتے ہیں نورِ جبینِ ازل مجھے

رنگِ ظہورِ خالقِ ارض و سما ہوں میں

عارف کے واسطے ہوں میں خورشیدِ معرفت یہاں

برہم زنِ طلسمِ شبِ ماسوا ہوں میں

گمراہ میری راہ پہ ہوتا نہیں کوئی

پرتو دہِ چراغِ طریقِ صفا ہوں میں

مشکل نہیں ہیں راہِ حقیقت کے مرحلے
منزل نہیں ہے دُور اگر رہنما ہُوں مَیں

دیتا ہُوں بے نشاں کا نشاں کچھ نہ کچھ ضرور
طالب زمانہ جس کا ہے اُس کا پتا ہُوں مَیں

ہرچند وہ رسائیِ دانش سے دُور ہے
ہے یہ بھی جاننا، کہ نہیں جانتا ہُوں مَیں

میراثِ انبیا مرا مشہُور نام ہے
سیدھا سا اِک وسیلۂ قربِ خدا ہُوں مَیں

دیتا ہے گو یہ سارے زمانے کو روشنی
رُتبے میں آفتاب سے لیکن سوا ہُوں مَیں

اس آفتاب میں تو ہے ظاہر کی روشنی
دراصل آفتابِ حقیقت نما ہُوں مَیں

ظلمت فزائے دل مہ و خورشید ہوں ابھی
چشمِ جہاں سے آج نہاں گر ذرا ہُوں مَیں

میرا وطن نہ پوچھے مجھ سے کہ صبح و شام
غربت میں مثلِ بادیہ گردِ صبا ہُوں مَیں

اُس سرزمیں پہ کرتا ہوں چندے قیام بھی
جوہر کی اپنے قدرِ جہاں دیکھتا ہُوں مَیں

نفرت غرور و کبر سے ہے کاہلی سے ہے
ان کا جہاں عمل ہو، وہاں سے اُٹھا ہُوں مَیں

اس مملکت میں مَیں نے گزاری ہیں مُدّتیں
سچ پوچھے تو ہند میں پیدا ہُوا ہُوں مَیں

جنّت نشاں یہی ہے پُرانا وطن مرا
پروان چڑھا اسی میں، اسی میں بڑھا ہُوں مَیں

پالا اسی نے دامنِ شفقت میں ہے مجھے
سائے میں اس کی دہر کے صدیوں رہا ہوں میں
یونان و مصر میں بھی پھرا مدّتوں، مگر
جس مُلک میں گیا ہوں یہیں سے گیا ہوں میں
گنگا کے یہ کنارے، ہمالہ کی چوٹیاں
تھے میری سیرگاہ، انہیں جانتا ہوں میں
یورپ میں آج کل ہیں مرے قدرداں، مگر
واں صرف مادّۂ بے بقا ہوں میں
بھارت ورش میں جب تھے مرے دن عروج کے
اُس وقت کیا تھا، آہ! مگر آج کیا ہوں میں
جس رنگ میں ہوں خیر وہی رنگ خوب ہے
ظاہر ہوں جس ادا میں، بہت دلربا ہوں میں

کچھ ذوقِ دید ہے، تو جوانانِ زندہ دل
دیکھو مجھے کہ شاہدِ رنگیں ادا ہوں مَیں
ایسے مزے نصیب کہاں ہیں حواس کو
مجھ میں وہ رس ہے لاکھ مزوں کا مزا ہوں مَیں
رکھتا ہوں اپنے طالبِ صادق کو شاد کام
مائل کوئی مرا ہے تو اُس پہ فدا ہوں مَیں
رہتا ہوں مثلِ مردمکِ چشم آنکھ میں
مٹتا نہیں ہوں دل سے، وہ نقشِ وفا ہوں مَیں
ہر مُلک، ہر دیار میں عالم کی قدر ہے
سارا زمانہ دوست ہے، گر آشنا ہوں مَیں
بوڑھوں میں رکھتا ہوں میں جوانوں کی آن بان
وہ ہاتھ ناتواں نہیں، جس میں عصا ہوں مَیں

مفلس نہیں رہا کہیں طالب کوئی مرا
مَیں کوہِ زر ہوں، کانِ گہر، کیمیا ہوں مَیں
اقبال جس کو کہتے ہیں پروردہ ہے مرا
کیا سایۂ ہما ہے، ہما کا ہما ہوں مَیں
یورپ کو دیکھئے کہ ہے دولت سے مالا مال
وہ غوطہ زن ہے مجھ میں کہ بحرِ سخا ہوں مَیں
محتاج ہر ہنر ہے مرا، اور ہر ایک فن
مَیں ابتدا کمال کی ہوں، انتہا ہوں مَیں
خاک، آب و باد، و آتشِ سرکش بدیں جلال
سب میرے زیرِ حکم ہیں فرما نروا ہوں مَیں
رستے بنائے مَیں نے پہاڑوں کو چیر کر
ہمدم ذرا جو انجنیئر کا ہوا ہوں مَیں

مثلِ زمیں بنے ہیں سمندر پہ شاہراہ
بیڑے کو خوف کیا ہے، اگر ناخدا ہوں مَیں

ادنیٰ سا ہے کرشمہ، تعجّب ہے اس میں کیا
لے کر اگر بشر کو ہوا میں اُڑا ہوں میں

لونڈی ہے میری برق، بخارات ہیں غلام
دونوں سے تار، ریل کو چلوا رہا ہوں مَیں

ظاہر نظر فریب ہے، باطن ہے دلپذیر
ہر رنگ اور روپ میں جلوہ نما ہوں مَیں

موجود ہر الاپ میں ہوں، ہر خیال میں
ہوں شاعری کہیں، تو کہیں فلسفا ہوں مَیں

مَیں ہوں کہیں نقوشِ ریاضی میں جلوہ گر
منطق کے سلسلوں میں کہیں بولتا ہوں مَیں

پیدا کر دوں میں شیکسپیئر اور والمیک
ہے لطف گر معاونِ طبعِ رسا ہوں میں
اظہارِ امرِ واقعی محروم کر دیا
ورنہ نہ خود فروش، نہ کچھ خود نما ہوں میں

ترغیبِ سفر

بوئے چمن اگرچہ پریشاں سفر سے ہے
لیکن مشامِ خلق پہ احساں سفر سے ہے
گُل زینتِ گلوئے حسیناں سفر سے ہے
عزت کا بارِ دہر میں ساماں سفر سے ہے

برہم مزاج خام خیالاں سفر سے ہے
تکمیلِ پختہ کاریٔ انساں سفر سے ہے!

گھر میں جو اپنے بستۂ زنجیرِ در رہُوا
دیوانہ پیشِ اہلِ خرد وہ بشر ہُوا
دشوار جس کی چاہ میں ذوقِ سفر ہُوا
انساں کو مثلِ خانۂ زنداں وہ گھر ہُوا

آزادہ رَو نہیں ہے، جو ترساں سفر سے ہے
تکمیلِ پختہ کاریٔ انساں سفر سے ہے!

دیکھو زمیں پہ گردشِ شام و پگاہ کو
یا پھیرو سُوئے عالمِ بالا نگاہ کو
کب ہے قرار انجم و خورشید و ماہ کو
ہر وقت قطع کرتے ہیں غربت کی راہ کو

کل انتظامِ عالمِ امکاں سفر سے ہے

تکمیلِ پختہ کاریٔ انساں سفر سے ہے!

سمجھے کوئی فراستِ اہلِ فرنگ کو

ہر پھر کے دیکھتے ہیں یہ عالم کے رنگ کو

آخر ہلا کے سلسلۂ صلح و جنگ کو

لیتے ہیں ہند سندھ کو اور رُوم و زنگ کو

یورپ جہاں کُشا و جہاں باں سفر سے ہے

تکمیلِ پختہ کاریٔ انساں سفر سے ہے!

نت دیکھتی ہے آنکھ نظارے نئے نئے

شہر و دیار و مزرعہ سارے نئے نئے

دریا نئے اور اُن کے کنارے نئے نئے

پانی ہے موجِ طبع اُبھارے نئے نئے

دل لحظہ تازہ فرحاں سفر سے ہے
تکمیل پختہ کارئ انساں سفر سے ہے!

مفقود قدر جوہرِ قابل وطن میں ہے
شبنم رہینِ پستئ ہمّت چمن میں ہے
خوں دل عقیق کا اسی غم سے یمن میں ہے
اور نافہ داغِ حسرتِ قیمت ختن میں ہے۔

تاجِ شہی پہ گوہرِ غلطاں سفر سے ہے
تکمیل پختہ کارئ انساں سفر سے ہے!

ہو ذوقِ دل تو دید کے قابل ہیں بحر و بر
بیٹھے رہو نہ دیدۂ بینا کو موند کر
درپیش سب کو گلشنِ عالم سے ہے سفر
رہتا نہیں کبھی ثمرِ پختہ شاخ پر

ہے کچھ اگر، تو خام، کو نقصاں سفر سے ہے
تکمیلِ پختہ کاریٔ انساں سفر سے ہے!

شراب

فریبِ دہر نے تدبیرِ جاں نشانی کی
کہ شکل آگ نے کی اختیار پانی کی
ہوئے بلاکشِ مستیٔ سُرور کے جویا
کبابِ نارِ جہنّم ہیں نُور کے جویا
یہ آب وہ ہے کہ جس کے حباب شعلے ہیں
یہی تو آتشِ مَے کے جناب! شعلے ہیں

جگر کو، جان کو، دل کو جلا کے چھوڑتی ہے
بشر کو کوئلہ آخر بنا کے چھوڑتی ہے
جلا کے جوہر ادراک کو دھواں کر دے
دماغ کو وہ اُبالے کہ نیم جاں کر دے
مقامِ حیف ہے ان کی یہ ابلہی، افسوس!
کہ آگ سے ہیں بجھاتے یہ تشنگی، افسوس!
نہ حور ہے، نہ یہ کوئی پری ہے شیشے میں
رہے خیال کہ آتش بھری ہے شیشے میں
ذلیل کرتی ہیں آخر شرارتیں اس کی
یہیں دکھاتی ہیں دوزخ حرارتیں اس کی
بِن آئی مرتے ہیں اکثر جو اس پہ مرتے ہیں
جہاں سے عین جوانی میں وہ گزرتے ہیں

نہیں ہے پھول یہ ہرگز، ہزار گلگوں ہو
کہیں نہ ذوق بہارِ شباب کا خوں ہو!
عدوِ آبرو و ننگ محض نام اُس کا
سُنے نہ کوئی شرارت بھرا پیام اُس کا
یہی بناتی ہے دیوانہ ہوشیاروں کو
گلی گلی میں گراتی ہے وضعداروں کو
یہ سر پہ جن کی طرح جب سوار ہوتی ہے
ہزار ہو کوئی عاقل، تمیز کھوتی ہے
ہم اس کو مایۂ فسق و فجور کہتے ہیں
جو بات کہنے کی ہے، وہ ضرور کہتے ہیں
اگر ہے تلخ، تو سَم سے بُری ہے مشفقِ من!
اگر ہے میٹھی، تو میٹھی چھُری ہے مشفقِ من!

ہجوِ مَے

آبِ رز میں مَیکشو! زہراب کی تاثیر ہے
موت خوابِ مستیٔ رندانہ کی تعبیر ہے

خندۂ جامِ پُر از مَے خندۂ تقدیر ہے
قُلقلِ مینا پیامِ نالۂ شبگیر ہے

جامۂ رسوائی تن پر، سر پہ ہے لعنت کا تاج
تیرگی منہ پر ہے، یہ مَے خوار کی تصویر ہے

بُوالہوس! اکسیر ہے بیشک شرابِ ارغواں
خاک کر دیتی ہے زر کو، ہاں عجب اکسیر ہے

ہے بزرگی بخش مَے، قرباں ترے پیرِ مغاں
گر ہے اس کو جواں، دو چار دن میں پیر ہے

چیر دیتی ہے جگر کو ٹکڑے کر دیتی ہے دل
یہ کوئی خنجر ہے، یا شمشیر ہے، یا تیر ہے

کیوں عذاب بادہ خواری ہند پر نازل ہوا
اے فلک! ہے کیا خطا؟ کیا جرم؟ کیا تقصیر ہے

صفحۂ ہستی سے مٹ جائیگا جوں حرفِ غلط
دل پہ لکھ رکھ بادہ کش! محرُوم کی تحریر ہے

→*←
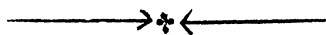
نوجوانو! شراب سے بچنا!

نوجوانو! شراب سے بچنا — اَثرِ زہرِ ناب سے بچنا!
آبِ آتش لباس ہے یہ مے — ننگ سے آب و تاب سے بچنا!
اس سے کب دل کی پیاس بجھتی ہے — ہاں! فریبِ سراب سے بچنا!

میکدہ یہ نہیں، جہنّم ہے — دُور رہنا! عذاب سے بچنا!

نہیں تو بل ہیں آبِ خنجر ہے — تیغِ برّاں کی آب سے بچنا!

کہیں کر دے نہ خانماں برباد — اسی خانہ خراب سے بچنا!

مُنہ لگا کر اسے نہیں ممکن — بوسہ ہائے گلاب سے بچنا!

میکشی ہے خدا کو نامنظور — آسمانی عتاب سے بچنا!

پندِ محروم پر عمل کرنا — نوجوانو! شراب سے بچنا!

دورنگیٔ زمانہ

عجب مختلف ہے زمانے کی حالت — نہ دیکھا کسی کے برابر کسی کو

بنایا ہے خود خالقِ دادگر نے — معزّز کسی کو محقّر کسی کو

کسی کو چڑھایا ہے عرشِ بریں پر — گرایا ہے فرشِ زمیں پر کسی کو

کسی کو سکونِ شبِ ماہ بخشا
کیا صورتِ برقِ مضطر کسی کو

رُلایا کسی کو ہے شبنم کی صورت
ہنسایا ہے مثلِ گُلِ تر کسی کو

کسی کو دئے اشکِ غم، زخمِ حسرت
فراواں دئے لعل و گوہر کسی کو

بٹھایا کسی کو سرِ گنجِ دولت
پھرایا گدائی میں در در کسی کو

مرصّع ہے اشکوں سے دامن کسی کا
ملی موتیوں کی ہے جھالر کسی کو

کیا ہے کسی دل کو نرمی میں پانی
دیا ہے عوض دل کے پتھّر کسی کو

کسی کو ملی کلفتِ شامِ ہجراں
ملی راحتِ وصلِ دلبر کسی کو

کسی کا ہے خونِ جگر پہ گُزارا
دیا بادۂ نابِ احمر کسی کو

کسی کو ہے آئینہ سیما بنایا
بنایا ہے حیران و ششدر کسی کو

بھٹکتا ہے کوئی کوئے گمرہی میں
بنایا ہے اوروں کا رہبر کسی کو

کوئی اس جہاں کو سمجھتا ہے دوزخ
یہ دُنیا ہے فردوس منظر کسی کو

یہ سب کچھ بجا ہے، مگر آخر اک دن
کرے گی اجل ایک سا ہر کسی کو!

اُستاد

اِدھر ہے جہل، اُدھر علم، درمیاں اُستاد
وسیلۂ خردآموزئ جہاں اُستاد!

ازل سے وارثِ میراثِ انبیا ہے یہ
بلند مرتبہ ہے زیرِ آسماں اُستاد!

نہاں ہیں فطرتِ انساں میں جوہرِ عالی
ہُنر سے اپنے ہے کرتا اُنہیں عیاں اُستاد!

ہے ذمّے تربیت اس کے جو نونہالوں کی
چمن میں قوم کے ہے مثلِ باغباں اُستاد!

ہر ایک نسل کو اک کارواں اگر کہیے
تو ابتدا میں ہے سالارِ کارواں اُستاد!

ہے پہلی منزلِ ہستی میں خضرِ راہِ حیات
نکوخصائل و ہمدرد و خوش بیاں اُستاد!
دل و دماغ کریگا کسی کے روشن کیا
نہ دل کو اپنے جلائے جو شمع ساں اُستاد!
پڑھا سکا نہ وہ کچھ بھی، دلِ تلامذہ پر
بٹھا سکا نہ اگر نقشِ جاوداں اُستاد!
جو اک نگاہ سے کرتے تھے خاک کو اکسیر
کہاں گئے وہ مُعلّم، وہ مہرباں اُستاد!
دلوں کی ہوتی تھی تعلیم فیضِ دل سے کبھی
زباں ہی آج تو شاگرد ہے زباں اُستاد!
ابھی مقاصدِ تعلیم سے ہیں دُور بہت
اگرچہ پاس کراتے ہیں امتحاں اُستاد!

کرے گا تشنہ دہانوں کو وہ جبھی سیراب
ہو علم و فضل کا دریائے بیکراں اُستاد!
نثار اُس کے لڑکپن پہ ہے جواں بختی
ملا ہے جس کو نکو خو و مہرباں اُستاد!

→+←
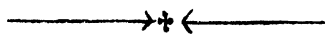
بچّوں کا ہفتہ

رباعی

بچّے ہیں قوم کا اہم سرمایہ
بے علم ہوں تو قوم بھی ہے کم سرمایہ
لاکھوں معصوم مرتے ہیں ہر سال
غفلت سے کھو رہے ہیں ہم سرمایہ

اُن کی حالت پہ نظر رکھتے نہیں اہلِ وطن
حیف بصد حیف! کہ ہیں ہند کے بچّے بیحال

بے خبران سے ہیں گلزارِ وطن کے مالی
بن کھلے اس لئے ہو جاتے ہیں غنچے پامال
ننّھی جانوں کو اجل دیتی ہے تکلیفِ سفر
راہیٔ مُلکِ عدم ہوتے ہیں لاکھوں ہر سال
مُلک میں یُوں تو مروّج ہیں مسائل کتنے
کبھی اُٹھتا ہی نہیں ان کی حفاظت کا سوال
قوم کے بچّے ہیں کیا، قوم کا سرمایہ ہیں
اس میں گنجائشِ انکار، نہ شک کی ہے مجال
کتنی قیمت کا ہے یہ بیش بہا سرمایہ
پوچھئے اُن سے جو قومیں ہیں جہاں میں خوشحال
فکر میں سُود و زیاں کی ہے جسے دیکھئے یاں
قابلِ غور نہیں کس لئے پھر راس المال

حیرت افزا ہیں یہ اطوارِ مآل اندیشی
کوڑیاں کرتے ہیں جمع اور گنواتے ہیں لال

بچے اس ملک میں ماں باپ کے ہوتے افسوس!
بے کسی کی نظر آتے ہیں سراپا تمثال

نہ انہیں ملتے ہیں موسم کے مطابق کپڑے
نہ غذا پر ہے توجہ، نہ صفائی کا خیال

تربیت کی ہے یہ حالت کہ وہی چل نکلے
اتفاقاتِ زمانہ نے چلا دی جو چال

کسی نزدیک کے مکتب میں بٹھا دیتے ہیں
گھر پہ جب اُن کی شرارت نظر آتی ہے وبال

کبھی بے جا ہے محبت، کبھی بے طور عتاب
یہ وہ باتیں ہیں بگڑ جاتے ہیں جن سے اعمال

جب کبھی مجمعِ اطفال پہ پڑتی ہے نظر
بیشتر یاس فزا ہوتی ہیں اس میں اشکال
بچۂ میش کی مانند نظر آتے ہیں سست
چاہیئے یُوں کہ ہوں اس عمر میں مانندِ غزال
دیکھ کر ہند کے بچّوں کا یہ حالِ ابتر
ایک خاتونِ نکو دل کے ہُوا دِل کو ملال!
کر دیا سال میں ہفتہ جو مقرّر اُس نے
پئے اطفال یہ ہفتہ ہے غنیمت فی الحال
رفتہ رفتہ کبھی آجائے گا ایسا بھی دَور
وقف ہو جائے گا ہر لحظہ برائے اطفال

حُسن اور زیور

نسرین و گل کے حُسن کا گہنا ہے سادگی
سوزیوروں کا زیورِ زیبا ہے سادگی

محتاج زیوروں کا اگر ہے، تو حُسن کیا
لعل و گہر کا دستِ نگر ہے، تو حُسن کیا

دیکھے تو ماہتاب میں کوئی صفائے حُسن
زیور بغیر کتنی ہے شانِ غنائے حُسن

تاروں سے حُسنِ شب ہے فزوں، کیا مگر ہیں یہ
زیور نہیں ہیں، رات کے لختِ جگر ہیں یہ

زیور سے ہو نہ طالبِ افزائشِ جمال
کچھ اَور ہے ذریعۂ آرائشِ جمال

حسنِ عمل سے روح کو اپنی نکھار تُو
پھر دیکھ حسنِ روکشِ گُل کی بہار تُو!

لے حسن مستعار، نہ زر سے نہ سیم سے
دے رُخ کو تاب جلوۂ حسنِ قدیم سے!

تیرے عمل حسیں ہیں تو بیشک حسیں ہے تُو
گو رشکِ ماہتاب بظاہر نہیں ہے تُو!
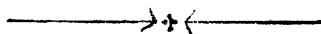
خیال پردۂ باطن میں کام کرتا ہے
اسی کا خارجی دُنیا میں نقش اُبھرتا ہے

نظر فروز ہیں جتنے مناظرِ زیبا

ہوئے بصورتِ اوّل خیال میں پیدا

جہاں میں جتنے ہیں ایوان و قصرِ نقش پذیر

رکھی خیال میں پہلے ہر ایک کی تصویر!

جو آکے دہر کے صنعتکدے میں چلتی ہے

وہ کل خیال کے سانچے میں پہلے ڈھلتی ہے

نہ ہوتی اوجِ فضا پر خیال کی پرواز

تو آج ہم کو نہ آتے نظر ہوائی جہاز

زہے خیالِ مصوّر کی جلوہ آرائی

عیاں ہے صفحۂ کاغذ پر شانِ برنائی!

فقط خیال سے صاحب کمال ہے شاعر

ہے سچ تو یہ کہ طلسمِ خیال ہے شاعر!

کبھی مرقعِ عبرت کبھی ہے بزمِ سُرور
جہاں کی شکل وُہی جو خیال کو منظور!
خیال بیج ہے اعمال کے درختوں کا
خیالِ نیک وطیرہ ہے نیک بختوں کا!

حیاتِ جاوید
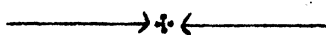
زندگی راحتِ دوام نہیں
زندگی رنج وغم کا نام نہیں

مطلقاً اپنے واسطے جینا
باعثِ ہنسیٔ دوام نہیں

زندگی ہے تو ہے وہی ابدی!
جس نفسانیت کا نام نہیں

نہیں سالوں پہ کچھ مدارِ حیات
موت پر زندگی تمام نہیں

گو نفس قاطعِ حیات ہُوا
پھر بھی یہ تیغِ بے نیام نہیں

خاص بندوں کو ہی بقا حاصل　　ذکر محرومئ عوام نہیں

بعد مُردن بھی زندہ ہیں یہ لوگ　　ان کی صُبحِ بقا کو شام نہیں

چشمِ ظاہر سے گو ہوئے پنہاں　　دل میں کیا کر چکے قیام نہیں؟

ذکرِ جمؔ ہے ہر ایک محفل میں　　جم نہیں آج اور جام نہیں

زندہ ہیں جن کے نام جیتے ہیں

مر کے بھی وہ مدام جیتے ہیں

ہاں! سُن اے زندگی کے شیدائی　　چھوڑ اندیشۂ من و مائی

رہ خدمت میں باندھ کس کے کمر　　چاہتا ہے اگر توانائی

لازمی ہے رضائے خالق کو　　خدمتِ خلق سے شناسائی

حسرتِ آبِ زیست میں کتنی　　کی سکندر نے دشت پیمائی

لے گیا وہم اس کو تا ظلمات　　خواہشِ دل مگر نہ بر آئی

خاک سمجھا وہ رازِ ہستی کو　　تھا وہ صحرا نورد، سودائی

جس کو کہتے ہیں چشمۂ حیواں وہ یہی کارِ خیر ہے، بھائی!

زندگی اس سرائے فانی ہیں جس نے پائی، اسی سے ہے پائی

ذکر ایسوں کا ہے حیات افزا موجبِ جرأت و شکیبائی

روشنی کے یہ ہیں وُہی مینار

جن سے اقوام کے ہیں بیڑے پار!
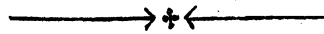
سیرِ گلستاں [۱]

(۱)

کیا نامدار زیرِ زمیں دفن ہو چکے

ہستی کا جن کی رُوئے زمیں پر نشاں نہیں

(۱) گلستانِ سعدی کے اشعار کا ترجمہ

اُس پیرِ لاشہ کو جو کیا دفن خاک میں
یُوں خاک کھا گئی، کہ کوئی استخواں نہیں
زندہ ابھی ہے عدل سے نوشیرواں کا نام
مُدّت ہوئی اگرچہ کہ نوشیرواں نہیں
نیکی کرو جہاں میں غنیمت ہے زندگی
وہ دن نہیں ہے دُور کہ جب تم یہاں نہیں

(۲)

سُنا ہے کہ پیارے خدا کے جو تھے — نہ کرتے تھے وہ دشمنوں کو بھی تنگ
تجھے کیسے حاصل ہو یہ مرتبہ — کہ ہے دوستوں سے بھی پرخاش جنگ

(۳)

ایک احمق اگر ہو محفل میں — ہونگے دانا کئی خفا دل میں
حوض اگر اک گلاب سے ہو بھرا — ایک کُتّا پلید کر دے گا

(۴)

ہیں تری خوبیاں ہتھیلی پر　　عیب پنہاں بغل میں ہیں لیکن
کھوٹے پیسے سے آخر اے مغرور!　　کیا خریدے گا مفلسی کے دن

(۵)

نہیں ہے مردِ دانا کے نزدیک　　لڑائی جو کرے پیلِ دماں سے
حقیقت میں وہی ہے مرد پورا　　ہو جب غصے، نہ بولے بدزباں سے

(۶)

اسی امید میں گزری دریغ عمرِ عزیز
کہ دل میں جو ہے وہ پوری ہو آرزو میری
امید ہو گئی پوری، ہوئی تو کیا حاصل
نہیں امید کہ واپس یہ عمر ہو میری

(۷)

اک دوسرے کے عضو ہیں انساں ہیں جس قدر
اک خانداں سبھی کا ہے، اک اصل، اک گہر
اک عضو کھا کے چوٹ اگر بے قرار ہو
جو دوسرے ہیں پھر انہیں کیسے قرار ہو
اَوروں کے دردوغم سے تو بے غم اگر رہے
ممکن نہیں کہ کوئی تجھے آدمی کہے

(۸)

پیٹ کو رکھ طعام سے خالی　　کہ نظر آئے معرفت کا نُور
تُو ہے حکمت سے اس لئے خالی　　کہ ہے کھانے سے ناک تک معمُور!

(۹)

اک شخص مدرسے کو گیا خانقاہ سے　　توڑا وفائے صحبتِ اہلِ طریق کو

پوچھا یہ میں نے عالم و عابد میں فرق کیا؟ — کیوں تو نے اختیار کیا اس فریق کو
بولا وہ اپنی جان بچاتا ہے موج سے — اور اس کی ہی یہ سعی کہ پکڑے غریق کو

(۱۰)

جو عالم کہے اُس کو دل سے سُنو — نہیں ہے وہ عامل، بلا سے نہ ہو
سُنو، قول یہ کچھ بھی سچّا نہیں — کہ سونے کو سوتا جگاتا نہیں
سدا ہو نصیحت سے تم بہرہ ور — لکھی گو نصیحت ہو دیوار پر

(۱۱)

ہاتھی کو گو پچھاڑ دے اک مردِ پہلواں
مردی نہیں ہے اُس میں اگر مردمی نہیں
عاجز ہے خاک، خاک سے آدم کی ہے سرشت
جس میں کہ عاجزی نہیں وہ آدمی نہیں

(۱۲)

رہا نہ حاتم طائی مگر قیامت تک رہیگا نام بلند اُس کا دہر میں مشہور
زکوٰۃ مال کی دے، کیونکہ فضلۂ رز کو جو کاٹتے ہیں تو دیتا ہے وہ بہت انگور

(۱۳)

زور آوری و مردی کے دعوے کو چھوڑ دے
جو نفس کا غلام ہے، عورت وہ مرد ہے
کیا مرد مُنہ کسی کا جو کلّے سے توڑ دے
میٹھا کسی کا مُنہ جو کرے بس وہ فرد ہے

(۱۴)

چُپ ہے جب تک آدمی پردے میں ہے گفتگو سے کھُلتے ہیں عیب و ہُنر
بند مُٹھّی میں دھری ہے چیز کیا کون بتلائے، کسی کو کیا خبر

(۱۵)

اے سیرِ انجم کو نانِ جویں ناپسند ہے
مجھ کو عزیز ہے، جو ہے تیری نظر میں زشت
اہلِ بہشت کے لئے اعراف ہے سقر
اہلِ سقر سے پوچھ کہ اعراف ہے بہشت

(۱۶)

کلوخ انداز سے جب کی لڑائی — سمجھ لے تو کہ شامت تیری آئی
جو دشمن پہ چلایا تیر تو نے — نشانہ اُس کا ہے خود، یہ سمجھ لے

(۱۷)

جس کو ملی ہے قوّتِ بازو و مرتبہ
شایاں نہیں کہ لوگوں کو لوٹے گزاف سے

سخت استخواں کو کوئی نگل بھی گیا تو کیا
پھاڑے گی پیٹ، اُترے گی ہرگز نہ ناف سے

(۱۸)

خوش کیونکہ ہو بادشاہ اُس سے
لوگوں پہ ستم کرے جو کوئی
گر چاہے خدا ہو تجھ سے راضی
کر خلقِ خدا سے تُو نکوئی

(۱۹)

مسکیں گدھا اگرچہ بہت بدتمیز ہے
لیکن وہ بوجھ اُٹھاتا ہے جس دم، عزیز ہے
لیکن یہاں ہیں موجب آزار جو بشر
ہیں وہ فضول، اُن سے تو بہتر ہیں گاؤ خر!

(۲۰)

وہ شخص جو کہ ہر گھڑی تجھ پر کرم کرے
کردے معاف اُس کو کبھی گر ستم کرے

(۲۱)

دوسروں کے عیب لے آتا ہے تیرے پاس جو
عَیب لے جائیگا تیرے دوسرے کے روبرو

(۲۲)

دشمن کی موت پہ ہو کیوں مجھ کو شادمانی
جب خود ہی بے بقا ہے میری یہ زندگانی

(۲۳)

کافوری شمع دن کو جلائے جو بے وقوف
ہوگا نہ شب کو تیل بھی اُس کے چراغ میں

(۲۴)

عالم جو کامرانی و تن پروری کرے
گمراہ خود ہے، کس کی بھلا رہبری کرے

(۲۵)

محتاج اُسی در کے ہیں سب مفلس و زردار
زردار زیادہ جو ہیں محتاج زیادہ

(۲۶)

وہ ہر سُو دوڑتا ہے، جس کو وہ در سے ہٹاتا ہے
کسی در پر نہیں جاتا جسے وہ خود بُلاتا ہے

(۲۷)

اگر کرتا، جو کچھ ہُوں جانتا میں
تو ہوتا نیک خُو اور پارسا میں

(۲۸)

لوگوں کی ملاقات کو جانا تو نہیں عیب
اتنا بھی نہ جاؤ کہ وہ کہہ دیں کہ نہ آؤ

(۲۹)

پیچھے جو تجھ کو چھوڑ چلا وہ شخص ترا ہمراہ نہیں
مت اُس سے لگا تُو دل اپنا، جس شخص کو تیری چاہ نہیں

نکاتِ شیکسپیئر

۱۔ بادشاہوں کی مصائب

(رچرڈ کی زبانی)

نہ چھیڑو ماجرا آرام و راحت، عیش و عشرت کا
بجا ہے ذکر لوحِ تربت اور کرمانِ تربت کا!
بجا ہے اشکِ خونیں چشمِ گریاں سے بہائیں ہم
اور اس سے خاک پر افسانۂ غم لکھتے جائیں ہم

چُنیں جلاد اپنے اور کریں فکرِ وصیت کچھ
مگر کیسی وصیت؟ جب نہیں باقی وراثت کچھ

یہی لے دے کے جسم اپنا، یہ مشتِ خاک باقی ہے
سپردِ کُنجِ مرقد اس کو کر دینا ہی کافی ہے

تمام املاک اپنی، زندگی اپنی، امیر اپنے
ہوئے سب غیر کے، اب غیرِ مرگ اپنا کسے کہئے

اجل اپنی ہے اب یا ڈھیر وہ خاکِ بیاباں کا
محافظ جو بنے گا بعدِ مردن جسمِ بے جاں کا

اِدھر آؤ، خدارا! خاک ہی پر بیٹھ جائیں ہم
اَلَم آگیں فسانے مرگِ شاہاں کے سُنائیں ہم

ہوئے معزول بعض اور بعض کام آئے لڑائی میں
پھنسے بعض اپنے مقتولوں کی رُوحوں کی بُرائی میں

ہوئے مسموم بعض اپنے حرم میں بے وفائی سے
ہوئے مقتول سوتے میں عذاب انتہائی سے
خلائے تاج شاہی میں کہ ہے زیبِ سرِ فانی
لگائے رکھتی ہے دربار اجل، وہ دشمنِ جانی
وہاں سے خندہ زن رہتی ہے شوکت اور صولت پر
ذرا سی دیر دے کر فرصتِ اظہارِ کرّ و فر
ہوائے کبر و نخوت سے سرِ ناداں کو بھرتی ہے
یہ مشتِ خاک دعوے آہنی ہونے کا کرتی ہے
اجل اپنی ظرافت ہائے جورآگیں سے خوش ہو کر
چبھو دیتی ہے اس دیوارِ قصرِ تن میں اک نشتر
نہ شاہنشاہ رہتا ہے، نہ وہ اجلالِ سلطانی
نہ آدابِ جہانگیری، نہ آئینِ جہانبانی

ادب یوں ننگے سر ہو کر بجا میرا جو لاتے ہو
مری تکریم سے تکریم کا خاکہ اُڑاتے ہو!
یہ تکریم د مراسم چھوڑ دو، جانا نہیں تم نے
حقیقت کو مری ہستی کی پہچانا نہیں تم نے
تمہاری طرح آب و ناں پہ میرا بھی گُزارا ہے
نہیں مجھ کو بھی احساسِ غم و حاجت سے چارا ہے
ضرورت ہے احبّا کی، مطیعِ شادی و غم ہوں
یہ کہنا سخت بے جا ہے، کہ مَیں سلطانِ عالم ہوں!
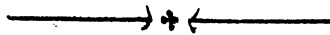
۲-رحم

جُنبش پذیر زور سے ہوتا نہیں ہے رحم
ہوتا ہے خود یہ صورتِ ابرِ کرم چکاں
روئے زمیں پہ از طرفِ اوجِ آسماں!

یہ رحم ہے دو گُونہ سعادت سے سرفراز
اک وہ سعید جس کی طرف سے ہُوا عیاں
اور دوسرا وہ، جس کو کیا اِس نے شادماں!

طاقتوروں میں طاقتِ اعلیٰ یہی تو ہے
شاہوں کے واسطے ہے بِہ از تاجِ زرفشاں
ہے اس سے زیب و زینتِ شاہانِ ذی نشاں!

مظہر ہے اقتدارِ مجازی کا وہ عصا

دستِ شہی میں جس کو میسّر ہے عزّ و شاں

بے شبہ ہے وہ سطوت و جبروت کا نشاں !

لیکن عصا سے رحم کا ہے مرتبہ بلند

نسبت عصا کو ہاتھ سے ہوتی ہے بیگماں

اور رحم تختِ دل سے ہے شاہوں کے حکمراں!

ہے رحم وصفِ خاص خداوندِ پاک کا

جب اُس کا جلوہ ساتھ ہوا عدل کے عیاں

پیدا وہیں بشر میں ہوئی شانِ قدسیاں !

→۹←

۳۔ پیٹ اور دیگر اعضائے تن

منحرف اک دن شکم سے ہو گئے اعضائے تن
اور یوں لائے زباں پر گفتگوئے طعنہ زن
غار کی صورت ہویدا درمیانِ تن ہے تو
سست ہے اور طعمۂ دلخواہ کا مدفن ہے تو!
تو ہمارے ساتھ کس دن شاملِ محنت ہوا
اپنا اپنا کام ہم تو کرتے رہتے ہیں سدا
کوئی ہم میں دیکھتا ہے اور سنتا ہے کوئی
کوئی ہادی اور تدبیر سراپا ہے کوئی
گرمِ رفتن کوئی ہے چھونا کسی کا کام ہے
اور انہی کاموں سے حاصل جسم کو آرام ہے

مسکرا کر پیٹ نے ان سے کہا اے دوستو!

طیش میں آ کر نہ مجھ پر پھبتیاں ایسی کہو

اوّل اوّل مجھ میں بیشک آتی ہے ساری غذا

درحقیقت ہے یہی باعث تمہاری زیست کا

کشورِ تن کے ذخیرے کی دکاں میں ہی تو ہوں

جمع جس میں ہو خورش، ایسا مکاں میں ہی تو ہوں

دل تمہارا اور دماغ، اے دوستانِ طعنہ زن

جن کو کہنا چاہیئے شاہ و وزیرِ ملکِ تن

پاتے ہیں مجھ سے غذا، دریائے خوں کی راہ سے

پوچھ سکتے ہو یہ تم اپنے وزیر و شاہ سے

اور شریانوں کی نہروں میں غذائیت تمام

بھیجتا ہوں میں، سو آتی ہے تمہارے اپنے کام

تم اگر چاہو تو دے دوں دانے دانے کا حساب

مجھ سے بیجا ہے شکایت، مجھ پہ بیجا ہے عتاب

مجھ سے لے جاتے ہو تم سب کھینچ کر ساری غذا

یہ تمہیں معلوم بھی ہے، مجھ میں رہ جاتا ہے کیا؟

۴- نیرنگِ تخیّل

دیوانہ و عاشق و سخنور	تخئیل کے سر بسر ہیں پیکر
دیوانے کی چشمِ وحشت آگیں	ہے دیکھتی ہر طرف شیاطیں
عاشق مبتلا جو وہم کا ہے	دیو اُس کی نظر میں مہ لقا ہے
حیرت آلودہ چشمِ شاعر	ہے فرش سے تا بہ عرش سائر

تخئیل کے زادگانِ موہُوم　　لوگوں کی نظر سے ہیں جو معدُوم

دیتا ہے انہیں بصد لطافت　　شاعر کا قلم کمالِ صورت

اشکال جو نیست ہیں سرِ دست

لیتی ہیں پہن وہ جامۂ ہست
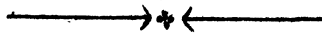
۵۔ ضمیر

(مذاقیہ انداز میں)

بیشک یہ چیز ہے خطرناک　　کر دیتی ہے دل کے حوصلے خاک

چوری جو کرو تو روکتی ہے　　جھوٹی قسموں پہ ٹوکتی ہے

ہمسائی سے آنکھ جب لڑائی　　آنکھیں یہ وہیں دکھاتی آئی

شرمانا ، لجانا اس کا ہے کام　　لیتی نہیں پہلو میں یہ آرام

ساتھ اس کے چلے تو کوئی کیونکر | ہے روکتی سنگِ راہ بن کر
پایا رستے میں کیسۂ زر | رہتا ہے یہ اتّفاق کمتر)
دیکھا ہی نہ تھا مجھے کسی نے | واپس دلوا دیا اسی نے
ہمدم اس کا جو ہو گیا ہے | دو روز میں وہ ٹکڑ گدا ہے
ازبسکہ یہ چیز پُر ضرر ہے | شہروں سے کی گئی بدر ہے

جو چاہتے ہیں مزے میں رہنا
مطلق نہیں رکھتے اس سے لہنا!
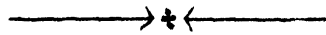
۶- اقسامِ غم

طالبِ علم و ادب کا غم نہیں ہے غم مرا | جو کہ رشک آمیز ہے
اور غم میرا نہیں غم زمزمہ پردانہ کا | جو کہ وحشت خیز ہے

غم مرا وہ غم نہیں جو دل میں درباری کے ہے | جس میں ہی ہوئے غرور
غم سپاہی کا نہیں وہ غم جو میرے دل میں ہے | ہی ہوس اس میں ضرور
غم جو میرے دل میں ہے قانوں داں کا غم نہیں | جو کہ دانا یا نہ ہے
غم نہیں وہ غم مرا دل میں حسینہ کے جو ہے | اور جو معشوقانہ ہے
غم مرا عاشق کے دل کا غم بھی تو ہرگز نہیں | جس میں سب وصف ہیں
پھر یہ کیسا غم ہے جس کا راز کچھ کھلتا نہیں | آہ! خود حیراں ہوں میں

۷۔ نغمۂ آسمانی

کیا شان ہے فرش آسماں کی | چُنیاں ہیں جڑی ہوئی سُنہری
ہے خُرد نزیں کرہ بھی اس کا | مانندِ فرشتہ نغمہ پیرا
گردش میں ہیں صاف گائے جاتے | اور سُر ہیں فرشتوں سے ملاتے

ہے ایسا ہی نغمۂ نہانی ۔۔۔ جزوِ ارواحِ غیر فانی

جب تک ہے یہ خاکِ تن میں روپوش
محروم ہے اس سے پردۂ گوش

۸۔ تقدیسِ نغمہ

نغمے سے سازِ ہستی جس شخص کا ہے عاری
ہوتی نہ جس پہ رقّت ہو زیر و بم سے طاری
غدر و قتال و سازش کے واسطے ہے موزوں
قلبِ سیاہ اُس کا ہے تیرگی میں شب گوں
ہر جذبہ مثلِ دوزخ تاریک و تار اُس کا
اُس پہ نہ کر بھروسہ، کیا اعتبار اُس کا؟

۹۔ نصیحت

ہر ایک سے کیجئے محبّت
چند ایک پہ اعتبار لیکن

دیجے نہ کبھی کسی کو ایذا
طاقت میں عدو سے کم نہ رہیئے

لیکن کیجے نہ پیش دستی!

احباب کو اپنے رکھئے دائم
اپنے ہی حلقۂ اثر میں

یہ عیب نہیں ہے سننے والے
کم گوئی پہ معترض اگر ہوں

لیکن ہے بُری فضول گوئی!

۱۰۔ وصلِ محبوب

اُس گوہرِ بے بہا کو پا کر — ہو جاؤں گا اس طرح تونگر
جس طرح کہ سیپیوں سمندر — ہو ریت تمام جن کی گوہر
پانی امرت ہو جن کا یکسر — ہر ایک چٹان تودۂ زر

۱۱۔ رنج میں راحت کا خیال

ہاتھوں میں اپنے آگ کو کس طرح لیجئے
دل میں خیال کر کے ہمالہ کی برف کا

بیٹھے ہوئے خیالی پلاؤ پکا یئے
مٹتی ہے بھوک پیاس کہیں اس طرح بھلا
چلئے نکل کے بڑفِ زمستاں میں برہنہ
پھر لیجے سر میں شدتِ گرما کی کچھ ہوا
راحت کا یوں خیال مصیبت میں، رنج میں
کرتا ہے اور رنج و مصیبت کو جاں گزا

۱۲۔ صادق دوست کی پہچان

جو شخص فی الحقیقت ہے دوستدار تیرا
جب وقت آپڑے گا ہوگا وہ یار تیرا
جب تو اداس ہوگا، آنسو بہائے گا وہ
بے خواب تو اگر ہے، سونے نہ پائے گا وہ

القصّہ تیرے دل پہ جو غم کا بار ہوگا
حصّہ بٹا ہی لے گا، جو یارِ غار ہوگا
ایسی نشانیوں سے کر لے تمیز تُو اب
یہ یار یارِ صادق، وہ یار یارِ مطلب

۱۳-قرائن

فلک پہ گھر کے جب ابرِ سیاہ آتا ہے
تو اوڑھ لیتے ہیں دانا ردائے بارانی
خیالِ آمدِ سرما کسے نہیں آتا
چمن کو دیکھ کے مصروفِ برگ افشانی
غروبِ مہر پہ انکارِ آمدِ شب کو
قرینِ عقل ہے کہئے جو محض نادانی

جو ابر و باد کے طوفاں اُٹھ آئیں بے موسم
تو جان لو کہ ہے نزدیک قحطِ طولانی

۱۴۔ قسمیں کون کھاتا ہے

قسمیں کھاتے ہیں واعظانِ معبد
کردار سے مختلف ہے جن کی گفتار
یا کھاتے ہیں بزدلانِ بیکس قسمیں
یا وہ جنہیں جانتی ہے دُنیا عیّار
یا وہ جو ہیں ناتوان دل و کم ہمّت
وانستہ جو رہتے ہیں مصائب کا شکار
قسموں سے سُنائی جاتی ہیں وہ باتیں
لوگوں کو سچائی سے ہو جن کی انکار

۱۵۔ بحرِ حیات میں ایک رَو

موج رواں ہے بحرِ حیاتِ بشر میں ایک
ہنگامِ مد اگر کوئی اُس پر سوار ہو

پہنچے وہ تا بساحلِ مقصودِ خرّمی — طوفانِ فتنہ زائے حوادث سے پار ہو
لیکن طفیلِ طالعِ واژوں جو چوک جائے — تا روزِ مرگ حسرت و غم کا شکار ہو

۱۶- جولیس سیزر کی لاش پر

مارک انٹونی کی زبانی

او صاحبِ اقتدار سیزر — پستی میں پڑا ہے تو زمیں پر؟
وہ فتح و ظفر وہ شان و شوکت — وہ فرّ و شکوہ و اوج و صولت
وہ وسعتِ ترکتاز و تاراج — اتنے ہی میں بس سمٹ گئے آج؟

۱۷- القابِ شاہی

ہیں فقط القابِ شاہی عزّ و شاں کے واسطے — ظاہری عزت ہے غمہائے نہاں کے واسطے
رکھتی ہے بیتاب ان کو اک خیالی انبساط — جو نہیں قابو میں ہرگز آنے والی انبساط

ان کے القاب اور تمہارے نام میں کیا فرق ہے　　فرق ہے بھی تو نمود ظاہری کا فرق ہے!

۱۸۔ بُزدلی

جو بُزدل ہیں وہ پہلے موت سے سو دفعہ مرتے ہیں
دلاور ایک بار اس دھر فانی سے گزرتے ہیں
جہاں کی جن عجب باتوں کا مجھ سے ذکر کرتے ہیں
یہ سب سے حیرت افزا ہے کہ اکثر لوگ ڈرتے ہیں
نظر جب صاف آتا ہے کہ اک دن خاتمہ ہوگا
وہ دن جب آئے گا آئے گا، حاصل ڈر سے کیا ہوگا

۱۹۔ دوستوں کی زبانی پیغام عشق

ہے دوستی معتمد بہر طور　　پر عشق کا ہے معاملہ اَور

ہو اپنی زباں سے اس کا اظہار — اور آنکھ ہو اپنی برسرِ کار

عاشق کے لئے یہی ہے زیبا — یہ کام نہیں پیامبر کا

۲۰۔ فضول خواہشات

بسکہ ہیں اپنے بد و نیک سے ناواقف ہم — ہوتے ہیں اپنی مصیبت کے طلبگار اکثر

التجا کرتے ہیں جب ہم تو ہمار خلی طر — کارسازانِ قضا کرتے ہیں انکار اکثر

فائدہ تیرا اسی بات میں ہے اے دلِ زار!

کہ چلی جائیں دُعائیں تری بیکار اکثر

۲۱۔ غازۂ زر

افعالِ زبوں کے زشت چہرے — نفرت سے نظر نہ جن پہ ٹھہرے

مَل لیتے ہیں جبکہ زر کا غازہ — دیتے ہیں دکھائی خوب و تازہ

۲۲۔ تلقینِ صبر

تلقینِ صبر کرتا ہے یوں تو ہر ایک شخص
پاتا ہے دوسروں کو وہ جب زیرِ بارِ غم
رہتے نہیں ہیں پند و مواعظ کسی کو یاد
دل اپنا جبکہ ہوتا ہے وقفِ فشارِ غم

۲۳۔ طاقت اور استعمالِ طاقت

دیو کی طاقت تنِ انساں میں ہے
بیگماں سرمایۂ صد افتخار
اس کا استعمال لیکن مثلِ دیو
آدمی کے واسطے ہے ننگ و عار

۲۴۔ شبنم

وُہی شبنم جو غنچے پر مثالِ گوہرِ غلطاں
نظر آتی تھی اِترائی ہوئی خود اپنی قسمت پر
برنگِ اشکِ چشمِ شاہدِ گُل میں نمایاں ہے
کوئی ہو اشک ریزاں جس طرح اپنی ندامت پر

۲۵۔ محنت اور عشرت

بالشِ سنگ بھی اگر مل جائے
چین سے اُس پہ سوتی ہے محنت
نرم ہو لاکھ بسترِ سنجاب
اُس پہ بے چین ہوتی ہے عشرت

۲۶ - بدسرشت

ہے غذا جن کی بغض اور عناد
برسرِ کیں ہیں اک زمانے سے

وہ نہیں چوکتے کسی صورت
اپنے اچھوں کو کاٹ کھانے سے

۲۷ - قدرِ شئے

قدر ہم اسکی نہیں کرتے ہیں پوری پوری
چیز جب ہوتی ہے اک پاس ہمارے موجود

ہاتھ ملتے ہیں وہ جب ہاتھ سے جا چکتی ہے
اپنے اوصاف کھا دیتی ہے ہو کر مفقود

۲۸ - کارِ احسن

ہوتا ہے چمک کے کارِ احسن
یوں تیرہ جہاں میں جلوہ افگن

جس طرح کہ دور تک ہے جاتا
چھوٹے سے چراغ کا جھمکڑا

۲۹ - لہو و بازی

سال بھر تعطیل بہرِ لہو و بازی ہو اگر
صورتِ کارِ گراں پھر لہو و بازی ہو دو بھر

۳۰ - اصلِ عادت

انساں کا یہی ہے رازِ فطرت
تکرارِ عمل ہے اصلِ عادت!

۳۱ - بہارِ اُلفت

وا دریغا! کہ بہارِ اُلفت
بے بقا صورتِ فصلِ گُل ہے

۳۲- حاصلِ زبان

وُہ مرد جس کے دہن میں زباں ہے، مرد نہیں
اگر حسینوں کو اُس سے نہ کر سکے تسخیر

۳۳- ادائیگیٔ حق

حق اُس کا ادا ہُوا سمجھ لو!
جاتے ہوئے مطمئن گیا جو!

۳۴- دُنیا کا سودا

جو دُنیا کے سودے میں ہیں دل لگاتے
وہ ہیں آخرِ کار نقصاں اُٹھاتے

۳۵- خونِ گرم

جس شخص کی رگوں میں ہو خونِ گرم جوشاں
بیٹھا رہے وہ کیونکر مانندِ نقشِ بے جاں

۳۶- تلبیس

کیا عجب، بہرِ مدعا، شیطاں
بن کے آجائے حافظِ قرآں

۳۷- آمدِ غم

۱- پئے بہ پئے آتے ہیں بے طرح جب آتے ہیں غم
دوسرا رکھتا ہے، جب ایک اُٹھاتا ہے قدم

۳۸۔ غم

غم سے اکثر ٹوٹتا ہے وقت و موسم کا نظام
شام ہو جاتی ہے صبح اور صبح ہو جاتی ہے شام

۳۹۔ تکلّف

جبکہ اندازِ محبت میں زوال آتا ہے
طورِ اخلاص تکلّف سے بدل جاتا ہے!

یادِ رفتگان

خوابِ جہانگیر

مژدۂ عیش نسیمِ سحری لائی ہے
دوش بر دوشِ صبا نکہتِ گُل آئی ہے
بزمِ قدرت میں عجب شانِ دل آرائی ہے
وقتِ مینوشی ہے اے شاہ گھٹا چھائی ہے
منتظر محفلِ عشرت ہے شہا! جاگ کہیں
او صبوحی کشِ مستانہ ادا! جاگ کہیں

مستی انگیز ہے کیا حسنِ شباب راوی
مست بیخود ہیں کہ آبی ہے نقاب راوی
جاگ! تجھ بن ہے نگوں جامِ حباب راوی
جوئے مے کر دے رواں جو ہو جواب راوی

موجِ دریائے طرب موجۂ صہبا ہو جائے
پار مستوں کا ترے نام سے بیڑا ہو جائے

جاگ اے شاہِ جہانگیر! جہاں بخشِ جہاں
اے شہِ مُلکِ سخا! طبل و نشان بخشِ جہاں
جاگ اے جانِ جہاں! روح و روان بخشِ جہاں
کہ ترا جلوۂ دیدار ہے جاں بخشِ جہاں

ایک عالم پئے دیدار چلا آتا ہے
درِ دولت پہ جہاں تیرے کھچا آتا ہے!

آہ! طاری ہے یہ کیا خواب گراں متوالے!
نہیں سنتا جو رعیّت کی فغاں متوالے!
کس تصوّر میں ہے! پھرتا ہے کہاں؟ متوالے!
دیدۂ خلق سے کیوں ہو گے نہاں متوالے!
چھوڑ کر تختِ شہی زیر زمیں جب سویا
بدلی کروٹ بھی نہ صدیوں سے، یہ اچھا سویا!

تختِ شاہانہ پہ وہ جلوہ نمائی تیری
ہائے او ظلِّ الٰہی! اِنھی خدائی تیری
چل بسی ساتھ ترے عدل روائی تیری
رل گئی خاک میں زنجیرِ طلائی تیری!
عدل و انصاف کا تیرے ہے فسانہ باقی
تو ہی باقی ہے نہ اب تیرا زمانہ باقی!

تو وہ تھا مست کہ تجھ سا کوئی ہُشیار نہ تھا

خلق خالق سے ہو غافل، تُو وہ میخوار نہ تھا

عہدِ میموں میں ترے کوئی بھی نادار نہ تھا

دَورِ مے تھا، ستمِ گردشِ ادوار نہ تھا

جبکہ مے خانہ سے مستوں کی دُعا اُٹھتی تھی

آبِ انگور لئے ساتھ گھٹا اُٹھتی تھی!

تُو نہیں مُلک میں لیکن تری شوکت ہے وُہی

سینۂ دشمنِ بدکیش میں ہیبت ہے وُہی

وہی رنگت ترے پھولوں میں ہے نکہت ہے وُہی

بعدِ مُردن بھی ترے نام کو عزّت ہے وُہی

کہ تری خاک زیارت کدۂ عالَم ہے

تُربتِ پاک زیارت کدۂ عالَم ہے!

نُورِجہاں کا مزار

دن کو بھی یہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے
کہتے ہیں یہ آرام گہِ نُورِجہاں ہے
مُدّت ہوئی، وہ شمع تہِ خاک نہاں ہے
اُٹھتا مگر اب تک سرِ مرقد سے دُھواں ہے
جلووں سے عیاں جن کے ہُوا طُور کا عالم
تُربت پہ ہے اُن کی شبِ دیجُور کا عالم!
اے حُسنِ جہاں سوز! کہاں ہیں وہ شرارے
کس باغ کے گُل ہوگئے؟ کس عرش کے تارے؟

کیا بن گئے اب کرمکِ شب تاب وہ ملنے ؟

ہر شام چمکتے ہیں جو رادی کے کنارے

یا ہو گئے وہ داغ جہانگیر کے دل کے ؟

قابل ہی تو تھے عاشقِ دلگیر کے دل کے !

تجھ سی مَلِکہ کے لئے یہ بارہ دَری ہے

غالیچہ سرِ فرش ہے کوئی، نہ دری ہے

کیا عالمِ بےچارگی اے تاجوری ہے

دن کو یہیں بسرام، یہیں شب بسری ہے

ایسی کسی جوگن کی بھی کُٹیا نہیں ہوتی

ہوتی ہو، مگر یُوں سرِ صحرا نہیں ہوتی

تعویذِ لحد ہے زَبر و زیر، یہ اندھیر!

یہ دَورِ زمانہ کے اُلٹ پھیر، یہ اندھیر!

آنگن میں پڑے گرد کے ہیں ڈھیر، یہ اندھیر!
اے گردشِ ایّام! یہ اندھیر، یہ اندھیر!

ماہِ فلکِ حُسن کو یہ بُرج ملا ہے
اے چرخ ترے حُسنِ نوازش کا گِلا ہے

حسرت ہے ٹپکتی درو دیوار سے کیا کیا!
ہوتا ہے اثر دل پہ اِن آثار سے کیا کیا!

نالے ہیں نکلتے دلِ افگار سے کیا کیا!
اُٹھتے ہیں شرر آہِ شرر بار سے کیا کیا!

یہ عالمِ تنہائی یہ دریا کا کنارا
ہے تجھ سی حسینہ کے لئے ہُو کا نظارا!

چوپائے جو گھبراتے ہیں گرمی سے تو اکثر
آرام لیا کرتے ہیں اس روضے میں آکر

اور شام کو بالائی سیہ خانوں سے شپّر

اُڑ اُڑ کے لگاتے ہیں در و بام پہ چکّر

معمور رہے یوں محفلِ جانانہ کسی کی

آباد رہے گورِ غریبانہ کسی کی!

آراستہ جن کے لئے گلزار و چمن تھے

جو نازکی میں داغ دہِ برگِ سمن تھے

جو گلرخ و گل پیرہن و غنچہ دہن تھے

شاداب گلِ تر سے کہیں جن کے بدن تھے

پژمردہ وہ گل دب کے ہوئے خاک کے نیچے

خوابیدہ ہیں خار و خس و خاشاک کے نیچے!

رہنے کے لئے دیدہ و دل جن کے مکاں تھے

جو پیکرِ ہستی کے لئے روحِ رواں تھے

محبوبِ دلِ خلق تھے، جاں بخشِ جہاں تھے

تھے یوسفِ ثانی، کہ مسیحائے زماں تھے

جو کچھ تھے، کبھی تھے، مگر اب کچھ بھی نہیں ہیں

ٹوٹے ہوئے پنجر سے پڑے زیرِ زمیں ہیں!

دُنیا کا یہ انجام ہے، دیکھ اے دلِ ناداں!

ہاں بھول نہ جائے تجھے یہ مدفنِ ویراں

باقی ہیں نہ وہ باغ، نہ وہ قصر نہ ایواں

آرام کے اسباب نہ وہ عیش کے ساماں

ٹوٹا ہوا اک ساحلِ راوی پہ مکاں ہے

دن کو بھی جہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے!

--->•<---

مرزا غالب

رسائی سے پرے ہے فکرتِ رفعت گزیں تیری
ہمارے آسمانوں سے بہت اونچی زمیں تیری

ترا ہر شعر شرحِ دفترِ رمزِ نہانی ہے
• نوائے سازِ فطرت ہے صدائے دلنشیں تیری

"خس ایں بیشہ پہلو میدرد آتش سواراں را"
رہِ نظمِ سخن میں پیروی آساں نہیں تیری

اگر ہو آسمانِ شعر پر رخشاں تری صورت
صفائی پا سکے ممکن نہیں ماہِ مبیں تیری

کہاں زیبا ہے تیرے عشق کو عشقِ بتاں کہنا
سمجھ ہی جب نہیں سکتے زباں ہرگز حسیں تیری

نہ وہ ساغر، نہ وہ ساقی، نہ وہ میخانہ ہے باقی

مگر جوشاں ابھی تک ہے شرابِ آتشیں تیری!

تیری رُودادِ اہلِ دل کو ہے فردوسِ گوش اب تک

وہ دلّی میں تیری دُھومیں، وہ بزمِ آخریں تیری

مُرقّعے حُسنِ پنہاں کے جو تُو نے کھینچ ڈالے ہیں

عجائب خانۂ افکار میں سب سے نرالے ہیں!

فلک پیما تخیّل کو ملا جب اوج تاروں کا

ہُوا آئینۂ عالم آسماں کے پردہ داروں کا

تعجّب کیا کہ اُٹھ سکتا نہیں اپنی نزاکت سے

یہ پردہ شاہدِ معنی کے رُخ سے استعاروں کا

قصیدہ گوئی میں بھی شانِ خودداری رکھی قائم

ستائش گر ہُوا اک آن سے تُو تاجداروں کا

بوئے عشقِ حقیقی داغِ دل سے تیرے آتی ہے

بظاہر گو نظر آتا ہے سودا ماہ پاروں کا

جگر کو کھود کر وہ شاہدِ رعنا تراشے ہیں

ہوا پھر تازہ قصّہ کوہکن اور کوہساروں کا

ادائے خاص سے تو نے صلائے عام دی سب کو

رہا پھر بھی مگر محبوبِ دل معجز نگاروں کا

ترا مضمونِ فصلِ گل پڑھے صحرا میں گر کوئی

نظر آئینہ دار آئے ہر اک ذرہ بہاروں کا

"ستائش گر ہے واعظ اس قدر جس باغِ رضواں کا

وہ اک گلدستہ ہے تیرے تخیّل کے گلستاں کا"

نوحۂ وفاتِ سُرور

دل پہ بیٹھا آ کے پھر تیرِ جفائے آسماں
لے گئی کس کو اُٹھا کر آہ! مرگِ ناگہاں
ہر طرف چھایا ہُوا ہے کیوں خموشی کا سماں
بزمِ ہستی سے ہوئے رخصت سُرور خوش بیاں
آہ گلچین اجل سے کیسی نادانی ہوئی
پھول وہ توڑا کہ گلشن بھر میں ویرانی ہوئی!
آہ! اُس عالم سے تھی تجھ کو بہت دلبستگی
دل میں تیرے تھی ہمیشہ آرزو پرواز کی
یہ زمینِ پست رہنے کے ترے قابل نہ تھی
رُوح تیری رہ نوردِ عالمِ بالا رہی

تُو تو پہنچا اپنے گھر، لیکن ہمارا کیا علاج !
کچھ بتا نا تھا ہمیں بھی دردِ فرقت کا علاج !

آرزو جنّت کی تھی؟ ہندوستاں کچھ کم نہ تھا
سَیرِ شاعر کے لئے یہ گلستاں کچھ کم نہ تھا
گنگا جمنا کے مناظر کا سماں کچھ کم نہ تھا
زمزم و کوثر سے یہ آبِ رواں کچھ کم نہ تھا
ہند میں ساماں تھے سارے جنّت الفردوس کے
کس لئے ترکِ وطن کا پھر خیال آیا تجھے ؟

گلشنِ ہستی سے تُو گرمائلِ پرواز تھا
نغمہ ہائے دلنشیں کا چھیڑنا کیوں ساز تھا
آہ! تُو قدرت کے رازوں کی طرح اک راز تھا
تیری ہستی پر ہمیں اے وائے! کتنا ناز تھا

باعثِ وحشت ہوئی ہے تیری روپوشی ہمیں
مائلِ فریاد کرتی ہے یہ خاموشی ہمیں!

کیٹس[1] اور شیلے پہ کی تھی نوحہ خوانی ہائے ہائے
اُن کی پُرغم داستاں تیری زبانی ہائے ہائے
وہ دلوں کے ولولے وہ نوجوانی ہائے ہائے
اور پھر دونو کی مرگِ ناگہانی ہائے ہائے

جام تجھ کو ساقیٔ دَوراں نے ویسا ہی دیا
ہائے! ظالم نے بھری محفل کو تڑپا ہی دیا!

شاعرانِ خوش بیاں ہیں اور کئی ہونگے یہاں
فکرِ عالی بھی نہیں کمیاب زیرِ آسماں

[1] کیٹس اور شیلے انگلستان کے دو جوانا مرگ شاعر۔ دونوں اٹلی میں فوت ہوئے
سرسرور نے اپنی نظم میں ان پر نوحہ سرائی کی ہے۔ (محروم)

حُسن والفت کی بھی سُنتے جائینگے ہم داستاں
نل دمن کا بھی نکل آئے گا کوئی ترجماں
شعر کو دے گا مگر خونِ جگر سے رنگ کون ؟
حُسنِ فطرت کے دکھائے گا ہمیں ارژنگ کون؟

تیرے ماتم میں ہے ساری بزمِ قدرت سوگوار
روتے ہیں گنگ وجمن مل کر گلے زار و قطار
لالۂ خونیں جگر ہے سوزِ غم سے داغدار
خاک اُڑتی پھرتی ہے ہر کنج میں بادِ بہار
کھول کر زلفیں نہ روئے کیوں عروسِ برشگال
کون ہے اب آہ! تجھ سا واصفِ حُسنِ جمال
شاہدِ گل اپنے جوبن کو اُبھارے کس لئے
سنبل صحنِ چمن گیسو سنوارے کس لئے

لہلہاتے سبزہ نہروں کے کنارے کس لئے؟
سین اب دکھلائے قدرت پیارے پیارے کس لئے؟

لالہ ساغر کیوں بھرے جب کوئی متوالا نہ ہو
کیا ضرورت حُسن کی جب دیکھنے والا نہ ہو!

کیا نہ اب ہوگا ترنّم ریز توسانوں میں بھی؟
گنگنائے گا نہ عہدِ رونقِ گلشن میں بھی؟

کیا نہ ہوگا شامل اب بلبل کے توشیون میں بھی؟
لالۂ صحرا سے بولے گا نہ ہرگز بن میں بھی؟

کیا ہمیشہ کے لئے تو بے صدا ہو جائے گا!
سازِ دل بیگانۂ رنگ نوا ہو جائے گا!

تیرے اُن نادیدہ مشتاقوں میں یہ محروم تھا
جن کا دل تیری جدائی میں سدا مغموم تھا

تیرے دل میں اور کچھ ہے یہ کسے معلوم تھا
آہ تو بھی اک طلسمِ ہستیٔ موہوم تھا

دل میں حسرت رہ گئی پہلو میں ارماں رہ گئے
اُٹھ چلا تُو اور اہلِ بزم حیراں رہ گئے!

جس طرح فلک پر کوئی مرغِ خوشنوا
دامنِ ابرِ بہاری میں ہو چھپ کر گا رہا
سُننے والا ہر گھڑی ہو آنکھ اُٹھا کر دیکھتا
شہپرِ مرغِ نظر لیکن ہو اُس تک نارسا

ہم یونہی دیدار کو تیرے ترستے رہ گئے
دیدۂ مشتاق کے بادل برستے رہ گئے

غمِ نادر

۲۰ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو منشی نادر علی خاں نادر کاکوروی نے جہانِ فانی سے رحلت فرمائی۔ مرض الموت خناق بیان کیا گیا ہے۔ نوحہ کے دوسرے شعر میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔

کلامِ نادر میں ایک دلکش خصوصیت ہے۔ اعلیٰ جذباتِ شاعرانہ کا اظہار دلپذیر الفاظ میں کچھ ایسے جدّت آمیز طور پر فرماتے ہیں کہ شعر تیر و نشتر کا کام کر جاتے ہیں۔ اور محض جذبات ہی نہیں، پڑھنے والے ایک روحانی لذت ملتی ہے۔ اور پاکیزہ سبق حاصل ہوتا ہے (محروم)

مرگِ نادر کی خبر کاش! نہ آئی ہوتی

باعثِ گریہ نہ پوچھو، نہ سنائی ہوتی!

اِک چہکتی ہوئی بلبل کا گلا یوں گھونٹا

ہائے او موت! تجھے موت ہی آئی ہوتی،

کیسا اندھیر ہے اے بادِ فنا کے جھونکو
آہ! یہ شمع تو تم نے نہ بجھائی ہوتی

او فلک! اور بھی نادر کو تو جینے دیتا
کونسی اس میں بھلا تیری برائی ہوتی

کب سے ہیں نالہ کش جور فنا دو معصوم
ان غریبوں کی فغاں کی شنوائی ہوتی

ندرت آمیز یہ تصویر تخیل افسوس!
دستِ بیدادِ اجل نے نہ مٹائی ہوتی

ہند میں آج تھا تو موجد نو طرزِ سخن،
کوئی دن اور تری تازہ نوائی ہوتی

تیرے جذبات مصفّا تھے جواہر نادر!
کوئی دن اور بھی دولت یہ لٹائی ہوتی

ابھی تازہ تھا غمِ رحلتِ آزادؔ و سرورؔ
ترے سر میں تو سفر کی نہ سمائی ہوتی

مرنے والے جو بہ تعداد بڑھے جاتے ہیں
داغ تیرے دلِ ناشاد بڑھے جاتے ہیں

گلشنِ ہند کی رونق تھا ترانہ تیرا
کون سے کُنج میں اب ہوگا ٹھکانا تیرا

دیر تک تجھ کو نہ بھولیں گے زمانے والے
گو بسر ہو گیا یوں جلد زمانہ تیرا

رو ئینگے خُم کدۂ شعر میں آنے والے
چھیڑے گا پیرِ مغاں جبکہ فسانہ تیرا

ساغرِ نو میں مئے کہنۂ سرمد کی جھلک
برقؔ شعلوں میں وہی سوز پرانا تیرا

بُوئے گُل پھاند کے دیوارِ گلستاں نکلی
بس یہی گلشنِ امکاں سے ہے جانا تیرا
زمزمہ سنجِ گلستانِ ارم ہو اب تُو
یا اسی باغ میں پھر گونجے ترانا تیرا
چشمِ ظاہر سے تجھے دیکھ نہیں سکتے ہم
اے کہ! تھا عیدِ احبّا نظر آنا تیرا
کارسازاں[1] کہ پرِ اسرار زبانت دادند
مُہرِ خاموشئ حسرت بہ لبانت دادند"

---

[1] نادرِ مرحوم کا اپنا شعر ہے:۔
کارسازاں کہ پرِ اسرار زبانم دادند
مہرِ خاموشئ حسرت بہ لبانم دادند

نوحہ

پھُول تو دو دن بہارِ جانفزا دکھلا گئے
حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

ویر بھان ایک نہائت ہونہار لڑکا تھا دس بارہ سال کی عمر تھی، چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا چیچک نکلی اور امتحان کے دن مُلکِ بقا کو روانہ ہوا۔ محروم کے دل پر صدمہ ہوا جس کا اظہار اشعارِ ذیل میں کیا گیا

آ جلد مدرسے پہنچ اے ویر بھان! آج
تجھ کو خبر نہیں ہے کہ ہے امتحان آج
ہیں آئے بیٹھے کب سے تیرے ہم سبق یہاں
آنا بھی تھا سویرے کہ ہے روزِ امتحاں

اتنی تو دیر کرنے کی عادت نہ تھی تجھے
کچھ غیر حاضری سے محبّت نہ تھی تجھے
تو سب سے روز پہلے پہنچتا تھا مدرسے
کیوں گھر پہ آج رہ گیا کیا ہو گیا تجھے؟
کھولی نہیں ہے کیا ابھی خوابِ سحر سے آنکھ!
سورج دکھا رہا ہے مریجاں اُدھر سے آنکھ
اُٹھ آنے والی رات پہ غفلت کو ٹال تو
اب مدرسے کا وقت ہے جُزداں سنبھال تو!
اے دیر بھان! آج تو بے طور نیند ہے
تجھ کو عبث جگاتے ہیں یہ اور نیند ہے
افسوس! تو تو اور ہی خوابِ گراں میں ہے
ہے رُوح اُس جہاں میں جسد اِس جہاں میں ہے

چیچک نے آہ! تجھ کو پیامِ قضا دیا
ہم کس طرح جگائیں؟ اجل نے سُلا دیا
گھڑیال کی صدا بھی نہ تجھ کو جگا سکی
بانگِ طیورِ صبح نہ کچھ کام آ سکی
کیسی گھڑی میں آہ! تجھے آئی سیتلا
اے کاش! کرتی رحم بھی کچھ مائی سیتلا
یوں ناشگفتہ غنچے کوئی توڑتا نہیں
گلچینِ مرگ آہ! مگر چھوڑتا نہیں
ہے ہے! عذاب موت کا ننھی سی جان پر
دیکھے سے جس کے پھٹتا ہے ماں باپ کا جگر
اُمید بھی ہے یاس کے زخمِ نہاں بھی ہیں،
مصروفِ چارہ سازی بھی ہیں نوحہ خواں بھی ہیں

تقدیر اُلٹ گئی کہ دوا میں اثر نہیں،
افسوس اب علاج کوئی کارگر نہیں!

بیٹھی ہے موت تاک میں نیچے پہ وار ہے
اب کیا رہا کہ تیر کلیجے کے پار ہے

اتنک بھی ہے یہ وہم کہ رُوٹھا ہُوا نہ ہو
شانہ ہلا رہے ہیں کہ سویا ہُوا نہ ہو

پر بولنا محال ہے اب ویر بھان کا
واقف نہیں رہا وہ ہمارے جہان کا

پڑھکر یہاں خموشئ جاوید کا سبق
ہے دیکھتا کتابِ بقا کا ورق ورق

ننھے سے دِل میں آہ! وہ طوفانِ ذوقِ علم
پہلو میں لیگیا ہے تو ارمانِ ذوقِ علم

وہ دِل فزا اُمیدیں وہ بچپن کے ولولے

تیرے یہ غمگسار، ترے ساتھ اُٹھ چلے،

اے آہ بچپنے کی وہ معصوم حسرتیں!

معدوم ہو گئیں تری موہوم حسرتیں

طے ہو گئیں وہ تیری خیالی ترقیاں

وہ عمر کے مدارِج عالی، ترقیاں!

وہ بھولی بھالی شکل ہے آنکھوں کے رُوبرو

کمرے میں پھر رہی ہے وہ تصویر ہوبہو!

اُبھرا ہوا وہ ماتھا، وہ آنکھیں غزال سی،

اور اُن پہ ابروؤں کی سجاوٹ ہلال سی!

آیا ہوا لبوں پہ تبسم ذرا ذرا

وہ توتلی زباں کا تکلم ذرا ذرا

بچپن کی شوخیاں وہ ادب سے رُکی ہوئیں
ہر وقت وہ کتاب پہ آنکھیں جُھکی ہوئیں

ہائے! وہ تیری ظاہر و باطن کی خوبیاں
بچے نہیں وہ ہوتے ہیں یہ جنکی خوبیاں

ہونا ہی تھا جُدا، کہ ہمیں تجھ سے پیار تھا
مرنا ہی تھا تجھے کہ بہت ہونہار تھا!

نوحہ

بروفاتِ حسرت آیات جنابہ
لیڈی ہارڈنگ صاحبہ آنجہانی

لنڈن بری ساعت گئیں، افسوس لیڈی ہارڈنگ!
واپس نہ واں سے ہو سکیں، افسوس لیڈی ہارڈنگ!
یہ موت ہے درد آفریں، افسوس لیڈی ہارڈنگ!
بیوقت دُنیا سے اُٹھیں، افسوس لیڈی ہارڈنگ
اے موت کیا آنکھیں نہ تھیں، افسوس لیڈی ہارڈنگ!

جیسے چمن میں ہو کوئی پھولی پھلی شاخِ چمن
ہو دیکھنے والے کو فردوسِ نظر جس کی پھبن
خوشبو و آب و تاب میں مشکِ ختن دُرِّ عدَن
بجلی گرے اس پر یکایک، حیف اے چرخِ کہن
اے آسماں! یہ طرزِ کیں، افسوس لیڈی ہارڈنگ!

اوصافِ دلکش سے زمانے کو مُسخّر کر لیا
اور فتح دل کے ملک کو بے تیر و خنجر کر لیا
آتے ہی سارے ہند کو اپنا سراسر کر لیا،
دِل میں ہر اک چھوٹے بڑے کے تو نے جب گھر کر لیا
پھر کیوں گئی زیرِ زمیں، افسوس لیڈی ہارڈنگ!

مغرب میں ایسی کب ہوئی دیوی پتی برتا[1] کوئی
پروانۂ شمع وفا دیکھیں جو ہو تجھ سا کوئی

ــــــــــــــــــــــــــــــ
[1] شوہر پرست۔

دے گا فلک نعم البدل تیرا نہ اب اصلا کوئی
لینا تھا ظالم موت نے ایسا ہی کیا بدلا کوئی
شوہر کہیں، بچے کہیں، افسوس لیڈی ہارڈنگ!

دِلّی میں جس دم وار اپنا کر چکی تقدیر تھی
جب تھے ہراساں مرد و زن اور یاس دامنگیر تھی
اس وقت لیڈی ہارڈنگ! تو صبر کی تصویر تھی
کیا مایۂ توقیر تھی، کیا صاحبِ تدبیر تھی
دنیا میں لیکن اب نہیں۔ افسوس لیڈی ہارڈنگ!

صدمہ ہے بیشک جاں گسل اے نائب شاہِ جہاں!
لیکن قضا سے چارہ کیا، اے چارۂ بیچارگاں
حاکم ہو تجھ سا نیکدل اور یہ صلہ دے آسماں
بٹنے کی گر ہو چیز غم، تو بانٹ لے ہندوستاں

ہندی ہیں سب ماتم نشیں افسوس لیڈی ہارڈنگ

ماتمِ طالب

نوحۂ وفات منشی وِنائک پرشاد طالب بنارسی

خلوت گہِ عدم سے اسے وائے! ہم تو جب سے
اس منزلِ فنا میں محرومِ زار آئے
چلتے رہے جگر پر ہر روز غم کے آرے
تیغِ اَلم کے جڑ کے دل پر ہزار آئے
گلچیں تھے ہم بھی اچھے اِس گلشنِ جہاں میں
ریحان و گل کے بدلے دامن میں خار آئے

جب گوہر مسرت کی آرزو ہوئی ہے،
آنکھوں سے تا بہ دامن اشکوں کے تار آئے
پامال ہو چکے ہیں سارے نہالِ ارماں
اپنی بلا سے، جائے یا اب بہار آئے
داغوں پہ داغ کھانا تیرے نصیب میں ہے
کس طرح قلبِ مضطر! تجھکو قرار آئے
اُلٹا ہے یہ مقدّر ہو جائے نالۂ غم
کانوں میں اپنے جب تک صوتِ ہزار آئے
"در محفلے کہ یاراں شرب مدام کردند
چوں نوبتے بما شُد، آتش بجام کردند"
ایدل! کدہر چلا ہے؟ تسکیں کی آرزو میں
بزمِ سخن کی جانب؟ بزمِ سخن میں کیا ہے!

اُٹھ کر چلے گئے ہیں اہلِ سخن وہاں سے
محفل اُجڑ چکی ہے، نقشہ بگڑ چکا ہے؟
آرام کر رہے ہیں خاکِ دکن میں دونوں
کیا ذوقِ دید تجھ کو داغؔ و امیرؔ کا ہے؟
آزادؔ اور حالیؔ ملکِ سخن کے والی
کیا یاد اُن کا مرنا تجھ کو نہیں رہا ہے؟
نادرؔ۔ سُرورؔ۔ افقؔ بھی کل تک سخن سرا تھے
مجلس میں آج اُن کی سناٹا چھا رہا ہے؟
لے اور داغِ تازہ طالبؔ بھی چل بسے ہیں
کہرام بمبئی میں چاروں طرف بپا ہے؟
نظّارہ گئے حسنِ قدرت کے غم میں کیا کیا
دے دے کے سر سمندر ساحل پہ مارتا ہے

نامِ جنابِ طالبؔ عزّت سخنوروں کی
بزمِ سخن کی وقعت، رونق تھیٹروں کی
تا صبحِ روزِ محشر تابندہ جو رہیگا
یہ ہے وہ داغ سوزاں اے لالہ زارِ ہستی
بزمِ سخن سے گرمی کافور ہو گئی ہے
افسوس! بجھ گیا ہے کس کا شرارِ ہستی
دِل ہو گیا مکدّر اے طالبؔ اک جہاں کا
دامن سے جھاڑ نِکلا جب تو غبارِ ہستی
معنی پذیر تجھ کو خالق نے دِل دیا تھا
تھی تیری طبعِ روشن آئینہ دارِ ہستی
وہ زندہ دِل مسافر کس سمت کو گیا ہے
مُلکِ عدم کدھر ہے! اے رہگذارِ ہستی!

گل سے کہا چمن میں بُلبُل نے کچھ سُنا ہے
تاراج کر گیا ہے کوئی بہارِ ہستی،
چاکِ جگر دکھا کر گل نے کہا کہ غم سے
خُوں کر چکا ہوں دِل تو میں دِل فگارِ ہستی
جب تک کہ ہے جہاں کو ذوقِ کلامِ طالب
زندہ رہیگا تیرا دُنیا میں نامِ طالب

نوحۂ چکبست

بپا زمینِ سخن پر ہے محشرِ شیون
گرا ہے آج کوئی آسمانِ اَوجِ سخن !
اماں کسی کو نہیں یُوں تو زیرِ چرخِ کہن
فلک بلند خیالوں کا خاص ہے دشمن
تُلا ہے جوہرِ عالی کو پست کرنے پر
دیا نجوم کو بھی ڈوبنا اُبھرنے پر!
سخن طرازوں میں چکبست بیمثال رہا
شہیدِ جلوۂ معنیٰ وہ خوشخصال رہا

متاعِ سوزِ قدیمی سے مالا مال رہا
کہ شمعِ انجمنِ دانش و کمال رہا
مٹا دیا اِسے سفّاک نے مٹانا تھا
کہ زد پہ تیرِ اجل کی بڑا نشانہ تھا!
خموش اگرچہ ہوا وہ فدائے حُبِّ وطن
ہوا میں گونجتے ہیں نغمہ ہائے حُبِّ وطن!
نہ کیوں مناظرِ حسرت دکھائے حُبِّ وطن
کہ ماتمی ہے سوادِ فضائے حُبِّ وطن!
وطن کو تیری ضرورت تھی آہ اے چکبستؔ
چلا ہے لیکے عدم کی تو راہ، اے چکبستؔ!
دِلوں کو اُنس نہانی تھا نام سے تیرے
تڑپ تڑپ گئے جوشِ کلام سے تیرے

کوئی نہ تشنہ رہا فیضِ عام سے تیرے
بقدرِ ذوق ملی سب کو جام سے تیرے
دکھا کے معنئ پر نور مے پرستوں کو
مئے سخن سے کیا ہوشیار مستوں کو!
سخنوری کا تری سب سے ہے جدا آئین
سخن کو رنگ حقیقت سے کردیا رنگیں
اگر ہیں شعر نفاست میں تیرے لعبتِ چیں
تو شانِ وقر میں کوہِ گراں سے ہیں سنگیں
ملا جو فیضِ ازل اس کی قدر کی تو نے
نیا وقار لیا تجھ سے نظمِ اُردو نے
ہر ایک شعر ہے صدق و صفا کا آئینہ
ہر ایک لفظ ہے حُسنِ ادا کا آئینہ

بیاں ترا ہے دلِ حق نما کا آئینہ
وطن پرستی و مہر و وفا کا آئینہ!
وہ جوت قلبِ مصفّا میں تیرے روشن تھی
کبھی جو وادیٔ گنگا میں عکس افگن تھی!
کہیں ہیں گنگ و جمن کی روانیاں دلکش
کہیں ہمالہ کے دامن کا ہے سماں دلکش
کہیں ہے گائے کی توصیف داستاں دلکش
ہر ایک نظم دل افزا۔ ہر اک بیاں دلکش
کہیں ہیں گلشنِ کشمیر کی وہ تصویریں
ادائے حورِ جناں کی ہیں جنمیں تاثیریں!
زباں پہ جب کبھی آتا تھا لکھنؤ کا نام
تو اس خیال سے ہوتا تھا خوش دلِ ناکام

کبھی تو آئیگی ایسی سعادتِ ایّام
مِلینگے حضرت چکبستؔ سے بشوقِ تمام
ملیں گے اب بھی مگر آہ! کب؟ کہاں؟ کیونکر؟
یہ راز اپنی نگاہوں سے ہے نہاں یکسر!

ماتم گرامی

تصویرِ درد و حسرت و رنج و محن ہے آج
ماتم میں آہ! کس کے عروسِ سخن ہے آج
لٹتے تھے جس میں بادۂ شیراز کے سبو
عبرت فزا اُجڑ کے۔ وہ بزمِ کہن ہے آج!
دنیائے شاعری میں کب آیا تھا یوں نظر
یہ ماتمی سکوت جو قفلِ دہن ہے آج
اورنگِ خسروئے سخن سے اٹھا ہے کون
سامانِ شعر بندشِ "گور و کفن" ہے آج!

بزمِ سخن سے کون روانِ سخن گیا
جو بیت شاعری کی ہے بیت الحزن ہے آج
نغموں کو آہ! موت نے شیون نے بنا دیا
لبریزِ آہ و نالہ فضائے وطن ہے آج
ماتم کا شور کشورِ پنجاب سے اُٹھا
راہی وطن سے کون سا فخرِ وطن ہے آج
فرشِ زمیں پہ کیوں صفِ ماتم کا ہے گماں
رحلت سے کس کی ایک جہاں نالہ زن ہے آج
فطرت کو بھی ہے شاعرِ رنگیں بیاں کا غم
وقفِ خزاں بہارِ گُل و نسترن ہے آج
ہر سمت بھرتی پھرتی ہے آہیں نسیمِ صبح
ماتم کی لَے ہیں نالۂ مرغِ چمن ہے آج

ہندوستاں تمام عزا خانہ بن گیا
پنجاب سے وُفورِ الم تا دکن ہے آج
نذرِ اجل ہے جانِ گرامی ہزار حیف!
رخصت ہوا وہ شاعرِ نامی ہزار حیف!
خاموش ہوگیا غزلِ فارسی کا ساز
بزمِ سخن سے اب نہ اُٹھیگی نوائے راز
اے یادگارِ حافظ و عرفی! کہاں ہے تو
اب ہم کریں گے کس کے کمالِ سخن پہ ناز
وہ سوزِ تشنگی کو بجھائیں کس جگہ
ہے جن کے دل میں ذوقِ شرابِ جگر گداز
پرتو سخن میں تھا ترے حُسنِ قدیم کا
تھے عزقِ حُسن تیری حقیقت۔ ترا مجاز

کی سیرِ اوجِ دل تری فکرِ بلند نے
حق نے دیا تھا تجھکو عجب ذوقِ سرفراز
سو رنگ سے سُنائی ہے تو نے حدیثِ دوست
جاں بخش ہر کنایہ ہے مثلِ نگاہِ ناز
حسنِ غیور نوحہ کرے آج تو بجا
زیبا ہے نالہ کش ہو اگر عشقِ پاکباز
عالم کو تو نے قدر شناسِ سخن کیا
کیوں نوحہ گر نہوں شعرائے سخن طراز
ایسی ہی تھی کشش کوئی باغِ نعیم کی؟
جس نے کیا وطن کی محبّت سے بے نیاز
اس ضعف میں کیا یہ سفر اختیار کیوں؟
سنتے ہیں راہِ ملکِ عدم ہے بہت دراز

تجھکو اُٹھا کے عالمِ بالا میں لے گئے
تھا قدسیوں کو ذوقِ نواہائے دلنواز
اپنے وطن میں آہ! گرامی نہ آئے گا
شاہِ دکن کا شاعرِ نامی نہ آئے گا

قطعۂ تاریخ

(بر وفات لالہ بیلی رام شاطرؔ)

محرُوم طفیل اتحاد معنی
نادیدہ رفیق تھا ہمارا شاطرؔ
دِل بیٹھ گیا و فور بارِ غم سے
جب ہم نے سُنا جہاں سے اُٹھا شاطرؔ

خوش خُلق، عزیز خاطرِ یک عالم

یارِ شاطر، وفا کا پُتلا شاطر!

غربت میں لیا عَدَم کا تو نے رستہ

یارانِ وطن سے کیا خفا تھا شاطر؟

ہو کیوں نہ بساطِ شاعری بے رونق

اس پر نہیں آج رونق افزا شاطر

تھی گھات میں موت مات کرنے کو ترے

کیوں تو نے کیا تخلّص اپنا شاطر

نالاں پایا مجھے تو بولی یوں عقل

واپس غم سے ترے نہ ہوگا شاطر

مانگ اس کے لئے جناب باری سے دعا

رحمت کا ہو مستحق خُدا یا شاطر

تاریخ وفات کے لئے بے سرو ہم

کافی ہے یہ۔ افسوس دریغا شاطر

۱۹۲۶ = ۶ - ۱۹۳۲

طوفانِ غم

اِن نظموں کا مجموعہ جو محرُوم نے اپنی اہلیہ کی وفات پر لکھیں

اشکِ حسرت

یہ آج ہونے لگی ہے کدھر کی تیاری
ہے بیطرح متر شّح نظر سے بیزاری
کہاں ہے آج تمہاری وہ طرزِ غمخواری
کہ بے اثر مرے نالے ہیں بے اثر زاری
یہ ہاتھ جوڑ کے مجھ سے معافیاں کیسی
چھڑی ہے آج یہ رخصت کی داستاں کیسی؟

ذرا تو دھیان کرو میرے سوزِ غم کی طرف
چلے ہو تاروں کی چھاؤں میں کیوں عدم کیطرف
نظر اُٹھاؤ ذرا میری چشمِ نم کی طرف
بڑھاؤ ہاتھ نہ اے جاں مرے قدم کیطرف

مجھے تو روکتے ہو یار بار رونے سے
رُکوگے کیا نہ مرے زار زار رونے سے

نہ کرکے جاؤ مجھے آہ! خانماں برباد
نہ دیکے جاؤ مجھے شغلِ نالہ و فریاد
رکھا ہے مَیں نے تمہیں اور تمنے مجھکو شاد
نہ جھیلی جائیگی ہجرِ دوام کی اُفتاد

کیا تھا عہدِ وفا مجھ سے عمر بھر کے لئے
ابھی سے ہو گئے تیّار کیوں اُدھر کے لئے

گذرنے پائے ہیں مشکل سے پانچ سال ابھی
شباب پر ہے تمہارا تو بال بال ابھی
عروج پر ہے عروسانہ چال ڈھال ابھی
نہ لاؤ موت کا دل میں ذرا خیال ابھی
تمہارے مرنے کے ایجاں! یہ دن نہیں ہرگز
جہاں سے اُٹھنے کو یہ سال وسن نہیں ہرگز!
دوا دوش مری بیکار جائیگی؟ افسوس!
دُعا مرے نہ کسی کام آئیگی؟ افسوس!
اجل جہاں سے تمہیں آج اُٹھائیگی؟ افسوس!
زمانہ بھر کے ستم مجھ پہ ڈھائیگی؟ افسوس!
فلک کو رحم نہ وِدّیا دتی پہ آئے گا؟
غریب و بیکس و معصوم کو رُلائے گا؟

لو! اُٹھ کے بیٹھو کہ وِدّیا سرہانے آئی ہے
تمہارے مُنّہ سے وہ دامن اُٹھانے آئی ہے
ادائے طِفلی کوئی تو دِکھانے آئی ہے
کہ ہنستی آئی ہے۔ تم کو ہنسانے آئی ہے!
وہ چل کے آئی ہے گھٹنوں پہ تھک گئی ہو گی
تمہارے پیار سے پھر اُس کو تازگی ہوگی!
اُٹھا بھی لو کہ بہت بیقرار ہے وِدّیا
نِگاہِ مہر کی اُمیّد وار ہے وِدّیا
رہینِ سختئ صدا انتظار ہے وِدّیا
نہ چھوڑ جاؤ اِسے۔ شیر خوار ہے وِدّیا
پکارتی ہے تمہیں آج کِس قرینے سے
اُبل کے شیر ٹپکتا نہیں ہے سینے سے؟

تمہاری مادرِ ناشاد ہے سرِ بالیں
خراب حال ستم دیدہ۔ خستہ و غمگیں
سنائی دیتے نہیں اُس کے نالہائے حزیں؟
یہ خوابِ ناز ہے کیا۔ چونک کر اُٹھو بھی کہیں
ذرا تو یاد کرو دِل فگاریاں اُس کی
بھلاؤ دل سے نہ تیمار داریاں اُس کی
وُہ میری مادرِ مجبُور و بیکس و بیتاب
تڑپ رہی ہے پڑی مثلِ ماہئے بے آب
تمہیں پکار رہی ہے۔ اُسے بھی کُچھ تو جواب
کرو نہ اُس کو زیادہ قتیلِ تیغِ عذاب
اُسے ہے آج ضرورت تمہاری خدمت کی
نہ پھیرو آنکھیں نہیں رسم یہ صداقت کی

کسی سے کرتے نہیں کوئی بات۔ وا اسفا!
نہ تھے تم ایسے تغافل صفات۔ وا اسفا!
دھرے ہی رہ گئے نبضوں پہ ہات وا اسفا!
کٹے گی کس سے یہ ماتم کی رات۔ وا اسفا!

چلے ہو چھوڑ کے روتا ہوا غریبوں کو
ہمیشہ روتے رہینگے - یونہی نصیبوں کو!

خیال میرے دِل دردمند کا کرتے
شریکِ شادی و غم تھے تو پھر وفا کرتے
نہ دیتے داغِ جدائی تو کیا بُرا کرتے
فلک سے آج نہ ہم شکوۂ جفا کرتے

چلے ہو گھر کو - مگر ہاں وہ کونسا گھر ہے
عزیز اس سے کوئی اور بھی سوا گھر ہے؟

جو چھت سے بچۂ کنجشک کوئی آن گرا
اُٹھا اُٹھا کے اُسے تم نے آشیاں میں رکھا
دیا ہے خوب مقدر نے آج یہ بدلا
تمہاری گود سے گرتی ہے خاک پر دیا
کرینگے اس پہ دل و جاں نثار ہم لیکن
تمام عمر رہے گی اُداس وہ تجھ بن!
ہے یاد مجھ کو وہ پرسوں کی زیرلب فریاد
تمہاری آہ! جگر سوز۔ پُرتعب فریاد
دل و جگر پہ مرے ڈھا گئی غضب فریاد
کہ کرنے والے نہ تھے تم تو بے سبب فریاد
مرض کا شکوہ نہ تقدیر کی شکایت تھی
فغاں میں ہائے! نکلتی وہ دل کی حسرت تھی

چلی ہوں چھوڑ کے بے پر کو آشیانے میں
کسی کا کون ہے ہمدرد اس زمانے میں
قضا کو خاک ملے گا مرے مٹانے میں
نہیں ہے عذر مجھے تو جہاں سے جانے میں
نہیں ملال کہ میرا مآل کیا ہو گا
یہ فکر ہے مری وِدّیا کا حال کیا ہو گا!
جو میری گود سے دم بھر جُدا نہ ہوتی تھی
جو میری آنکھ سے اوجھل ذرا نہ ہوتی تھی
میں اپنی بچی پہ کس دن فدا نہ ہوتی تھی
جو رات آنکھوں میں کٹتی خفا نہ ہوتی تھی
ہے کون جو مری نازوں پلی کو پالے گا
کوئی تو خاک سے گوہر مرا اُٹھا لے گا؟!

دردناک منظر

جاگو! اِسے اٹھا لو۔ سو کر اُٹھی ہے وِدّیا
کیوں برخلافِ عادت رو کر اُٹھی ہے وِدّیا
بیتاب اس طرح کیوں ہو کر اُٹھی ہے وِدّیا
صبر و قرار شاید کھو کر اُٹھی ہے وِدّیا
اس کو بھی غائبانہ معلوم ہو گیا ہے
خوابِ عدم میں تم ہو یا بخت سو گیا ہے
نظروں سے آہ! کیا کیا حسرت ٹپک رہی ہے
رہ رہ کے مُنہ ہمارا حیرت سے دیکھتی ہے

چہرے سے ہے نمایاں دل کی جو بیکلی ہے
تیری تلاش اِس کو اے مہرِ مادری ہے
وہ گود سے ہماری - آخر مچل کے نِکلی
جاتی ہے کِس طرف کو - گھٹنوں پہ چل کے نِکلی
گھٹنوں پہ چل کے نکلی بستر کے پاس پہنچی،
ننھے سے آہ دِل میں کچھ لیکے آس پہنچی،
کیا مطمئن سنبھالے ہوش وحواس پہنچی،
لیکن کچھ اس سے پہلے اے والئے! یاس پہنچی
کس کو پکارتی ہے مُنہ سے کفن اُٹھا کر
منزل پہ ٹھنڈے پہنچے وہ لَدلَدا کر
جی بھر کے دیکھ لے تو مُنہ اپنی پیاری ماں کا
موقع نہیں ہے وِدّیا! یہ ہوں کا اور ہاں کا

مطلب نہیں سمجھتی کیا تُو مری فغاں کا
ٹوٹا ہے ہاتھ تجھ پر بیدادِ آسماں کا
اب مانگتی ہے وِدّیا! غمگیں غاں کی داد کس سے
کرتی ہے بھولے بھالے دل کو تو شاد کس سے؟
ان سرد چھاتیوں میں کیا شِیر ڈھونڈتی ہے
پتھّر میں موم کی تو تاثیر ڈھونڈتی ہے
اب شمعِ کشتہ میں کیا تنویر ڈھونڈتی ہے
کیسے شکار ہائے! تقدیر ڈھونڈتی ہے
مُردے سے اپنی ماں کے یہ پیار کر رہی ہے
مجھ سخت جاں پہ یارب! یہ کیا گذر رہی ہے
ساری مصیبتوں سے وِدّیا! کڑی مصیبت
اُف! ہنستی کھیلتی پر یہ آپڑی مصیبت

تقدیر نے دِکھائی تجھ کو بڑی مصیبت
بھیرے اجل نے کیا سر چڑی مصیبت
ہیں جان و دِل مرے تو تجھ پر نثار و ّدیا!
کچھ اور چیز لیکن ہے ماں کا پیار و ّدیا!

کسی کے پھول

گنگا کو جا رہے ہیں ترے اَے نگار! پھول
تازہ رہیں گے مثلِ گُلِ نو بہار پھول
جل بجھ کے رہ گیا تنِ رشکِ چمن ترا،
لایا ہوں راکھ سے تری چُن کر دو چار پھول

بُوٹا سا قد وُہ آہ! بہشت بریں میں ہے
جھڑ کر جہاں میں رہ گئے بے شاخسار پھُول

کانٹوں سے بھی ہیں کم ترے پھولوں کے سامنے
باغِ جہاں کے او صَنَمِ گلعذار! پھُول

بُوئے وفا و رنگِ محبت سے تازہ ہیں
یہ بے نیازِ گردشِ لیل و نہار پھُول

مجبور آج یا دلِ ناخواستہ! دریغ!
گنگا کو سونپتا ہے کوئی دِل فگار پھُول

واپس وطن کو جاؤں گا داغِ جگر لئے
اب تک تھے میرے پاس تری یادگار پھُول

تسکیں فزائے خاطرِ ہجراں نصیب تھے
دورِ خزانِ غم میں رہے غمگسار پھُول

دھیمی تھی جن سے کچھ مرے سوزِ نہاں کی آگ
جاتے ہیں ہاتھ سے وہ دلِ داغدار پھول

تابِ سخن کہاں تھی مجھے فرطِ غم سے آج
ہوتے نہ گر سکوت شکن تازہ کار پھول

رہ رہ کے مجھ کو پھول ترے یاد آئیں گے
گلشن میں جب کھلائیگی بادِ بہار پھول

پھلتے رہیں گے آہ! مرے داغہائے دِل
کھِلتے رہیں گے یعنے یہاں بار بار پھول

دامانِ موجِ گنگ! نہ ہوتا تو اِتنہ تنگ
ہیں تازگی میں منتخبِ روزگار پھول

آغوشِ مہر کھولدے اِن کے لئے ذرا،
گنگا! ترے کرم کے ہیں اُمیدوار پھول

تجھ میں سمائیں گے روشِ نگہتِ چمن
زنہار تیرے دوش پہ ہونگے نہ بار پھول
یہ پھول وہ ہیں جنمیں ہے بوئے وفا بھی
تازہ مشامِ جاں ہے انہی سے مرا ابھی!

ہری دوار سے واپسی پر

کسی کے پھول جو گنگا میں ہم بہا کے چلے
جگر پہ آہ! نئے داغ اور کھا کے چلے
وہ پھوٹ پھوٹ کے روئے کنارِ گنگا پر
کہ نہر پہلوئے دریا میں اک بہا کے چلے

گئی نہ حیف! کدورت دلِ مکدّر سے
صفائے گنگ سے ہم خاک فیض پا کے چلے

نظر نہ محمل لیلائے انبساط آیا
مثالِ قیس بہت بن کی خاک اڑا کے چلے

پھرے پہاڑوں پہ سر مارتے ہم اے فرہاد
جگر پہ تیشۂ حسرت کی چوٹ کھا کے چلے

گھٹا نہ آہ ذرا بھی تو سوز پنہانی
پلٹ پلٹ کے نہائے۔ نہا نہا کے چلے

چلے ہیں ویسے ہی جیسے کہ آئے تھے محروم
وطن کو با دلِ غمدیدہ پھر پھرا کے چلے

قطعہ

غمِ ہجراں سے تنگ آ آ کر
پوچھتا ہوں یہی مقدّر سے
کر رہا ہے تو کیوں حلال مجھے
طولِ فرقت کے کند خنجر سے
سامنے میرے کوئی دم توڑے
اور دیکھوں میں دیدۂ تر سے،
حسرتِ مرگ ہو مگر نہ مروں
جان ہو جائے سخت پتھّر سے

دیکھنے کا میں دیکھتا رہجاؤں
جب جنازہ اُٹھے مرے گھر سے
درو دیوار سے اُٹھیں نالے
جو زیادہ ہوں شورِ محشر سے
گھر یہ چھا جائے ایک تاریکی
اَثرِ دورِ نحسِ اختر سے
جا کے شمشان میں وہ تن پھک جائے
جو ہو نازک سوا گلِ تر سے
آتشِ گل سے ہو جسے آسیب
داغ کھائے ہجومِ اخگر سے
اور معصوم ایک سال کی جان
گر کے آغوشِ مہرِ مادر سے

خاک پر لوٹ لوٹ کر روئے
ہوں رواں اشکِ ناب گوہر سے
ہائے یہ واقعات دیکھوں میں
گردشِ چرخِ فتنہ پرور سے
اور کلیجہ مرا نہ پھٹ جائے
یہ بھی ہوجائے سخت پتھّر سے
موت گھر میں ہو اور یُوں میری
جانِ بیزار موت کو ترسے
آہ! سیلاب میں رہوں پیاسا
اور ہو سَیل کا گذر سَر سے

مُدّعا کیا تھا اے قضا! تیرا
کچھ تو کہہ مجھ غریب مضطر سے

کیا سبب مجھے اور بھی ہے تڑپانا
طُول عہدِ فراقِ دلبر سے
زندہ چھوڑا ہے کِس لئے مُجھ کو
تو نے دنیا میں حالِ ابتر سے
ہوگا احساں جو فیصلہ کردے
پیشتر ساعتِ مقرّر سے
بخشتا ہوں تجھے حیات کے دن
کچھ ہیں باقی اگر مقدّر سے
شکوہ روزِ جزا تِرا ہرگز
نہ کروں گا جنابِ داور سے

نومبر کی ایک صبح

ہوتی ہے خوشگوار نومبر کی رات کیا
وہ رات چاندنی ہو تو پھر اس کی بات کیا
لبریز نور سے طبقِ آسماں تمام
فیضِ مہِ تمام سے روشن جہاں تمام
دلکش نظر فریب در و بام کی جھلک
ہر منظرِ شبانہ میں آرام کی جھلک
جاں بخش بعدِ شدتِ گرما کی راحتیں
دلچسپ آمدِ آمدِ سرما کی راحتیں

چاروں طرف ہوا کی خموشی سکوں فزا
یکرنگئ فضا کی خموشی سکوں فزا

ایسی ہی ایک رات تھی اور میں غریب تھا
ماتم شریکِ خاطرِ محزوں نصیب تھا

آدھی سے کچھ سوا شبِ ماتم تھی ڈھل چکی
شمعِ امید آہ! قریباً پگھل چکی

مہماں تھی کوئی دم کی مریضہ پڑی ہوئی
تقدیر نوحہ خواں تھی سرہانے کھڑی ہوئی

چہرہ کبھی جو رشکِ گلِ نوبہار تھا
اب زرد زرد برگِ خزاں دیدہ وار تھا

رہ رہ کے لے رہا تھا سنبھالے چراغِ عمر
اک داغ رہ گیا تھا سمٹ کر فراغِ عمر

ہر لحظہ برہمی وہ تنگ و تازِ نبض کی
بیقاعدہ ہر ایک نوا سازِ نبض کی

جب چارہ گر کو موت کا چارہ نہ مِل سکا
مجھ کو بغیرِ یاس سہارا نہ مِل سکا

حالت نگاہِ یاس زیسیں کی نظر میں ہے
اک تیر تھا کہ آہ! ابھی تک جگر میں ہے

حسرت بھری نگاہ کا پھرنا مری طرف
ہاتھوں کا آہ! چھُڑ کے وہ گِرنا مری طرف

حیرت میں آجتک ہوں کہ کیوں زندہ رہ گیا
کِس درجہ سخت جاں تھا کہ یہ صدمہ سہ گیا!

زوروں پہ جلوۂ شبِ مہتاب تھا ابھی
مائل بخواب دیدۂ بے خواب تھا ابھی

وہ شمع گُل تھی شمعِ سحر سے بھی پیشتر
ڈوبا وہ مہ غروبِ قمر سے بھی پیشتر
سورج چڑھا قیامتِ ہجرِ دوام کا
نظروں سے امتیاز مِٹا صبح و شام کا
گو دَم میں اپنے کثرتِ شیون سے دم نہ تھا
غم خانہ میرا عرصۂ محشر سے کم نہ تھا
مارا ہوا ہوں ایک نومبر کی صبح کا
ہے انتظار اب مجھے محشر کی صبح کا!

سارس کا جوڑا

کنارِ آب دورانِ سفر میں شام پڑ جانا
مصیبت خیز تھا سارس کے جوڑے کا بچھڑ جانا
شبِ تاریکِ فرقت میں بھٹکنا ان غریبوں کا
صدا دینا ۔ مگر قسمت کا ایسا پیچ پڑ جانا۔
کہ یہ اس پار لپکا اور اُڑا وہ دوسری جانب
یونہی تدبیر کا ہر بار بن بن کر بگڑ جانا

غرض شب بھر یونہی اک دوسرے کی جستجو کرنا
مقابل کے کناروں سے وہ ان کا ہاؤ ہُو کرنا

وہ آغوشِ تمنّا کھول کر مجبُور رہ جانا
وہ بیتابی سے اظہارِ و فورِ آرزو کرنا
سُنانا دُور سے وہ داستانِ شوق دونو کا
وہ اپنی بے بسی بیچارگی پر گفتگو کرنا

مگر آخر نشاں مشرق میں اڑنا مہرِ تاباں کا
اِدھر روپوش ہو جانا شبِ تاریکِ ہجراں کا
وہ صبحِ وصل کا آنا۔ وہ اُن کا شوق سے ملنا
غمِ دُوری کا مِٹ جانا۔ نکلنا دل کے ارماں کا
ستایش بخت کی کرتے ہُوئے اڑنا نشیمن کو
محبّت میں نئے سر سے وہ ہونا عہد و پیماں کا

نصیبا آہ! سارس سے بھی ہم نے تو بُرا پایا
کہ صبحِ وصلِ جاناں کو نہ ہرگز رُونما پایا
کبھی دم توڑ دینگے چُپکے چُپکے دامنِ شب میں
ابھی سے شامِ ہجراں کو بہت صبر آزما پایا
شبِ فرقت قیامت زا طلوعِ صُبح ناپیدا
مقدّر! تیرے اندازِ ستم کا مدعّا پایا

تمنّائے محروم

کاش! مل جائیں کہیں اور میں دکھاؤں چیر کر
سینہ اپنا جس میں طوفاں حسرت و ارماں کے ہیں

داغ گن گن کر دکھاؤں پھر دلِ بے تاب کے

یعنے وہ سارے نشاں جو صدمۂ ہجراں کے ہیں

دے اگر توفیق ہمت وہ بھی کر دوں آشکار

آہ! چرکے دل پہ جو تیغِ غمِ پنہاں کے ہیں

پھر کروں میں گوہرِ اشکِ رواں اُن پر نثار

جس قدر باقی صدف میں دیدۂ گریاں کے ہیں

اور کہوں اُن سے کہ بس اب ہو چکا انجامِ ضبط

ڈھنگ وحشت آشنا میرے دلِ حیراں کے ہیں

آئیے اور کیجئے ناشاد ماں کو شاد پھر

کب سے میرے دیدہ و دل منتظر احساں کے ہیں

آہ! اے محروم اے محنت کشِ ایامِ غم

ہم نے مانا تجھ پہ صدمے گردشِ دوراں کے ہیں

صبر بہتر ہے تری فریاد بیچ انجام سے
طور گو پُر درد تیرے نالہ و افغاں کے ہیں
تیری خاطر کون آتا ہے عدم سے لوٹ کر
یہ خیالی وسوسے تیرے دلِ ناداں کے ہیں

اب کے بھی دِن بہار کے یونہی گذر گئے

تضمین

پھر لالہ و گلاب چمن میں نکھر گئے
نالے ہزار کے ہمیں آگاہ کر گئے
صدموں کے آہ! دِل سے نہ اب تک اثر گئے
ہم سیرِ گلستاں کو بھی تھامے جگر گئے

اب کے بھی دن بہار کے یونہی گذر گئے!

نالے دلِ غریب کے سب بے اثر گئے
جانے سے اپنے وہ ہمیں نا شاد کر گئے
آغازِ فصلِ گُل سے بہت پیشتر گئے
اے طُولِ انتظار! بس اب ہم تو مر گئے
اَب کے بھی دِن بہار کے یونہی گذر گئے!

گلشن کے پھُول دِل پہ مرے داغ دھر گئے
کانٹے تمام آہ! جگر میں اُتر گئے
سُنتے تھے شاہدانِ لبِ جُو نکھر گئے
ہم ان کے دیکھنے کو۔ بہ مژگانِ تر گئے
اب کے بھی دِن بہار کے یونہی گذر گئے

فصلِ بہار دھوم سے آئی تو کیا ہُوا

بلبل اگر ہے زمزمہ پرواز مجھ کو کیا
پامالِ غمِ ازل سے دل بے قرار تھا
پس ہی گیا ہے۔ اَبکے وہ کوہِ الم گرا
اب کے بھی دِن بہار کے یونہی گذر گئے!

ہو جاتے ہیں کچھ ایسے ہی ساماں بہار میں
دِل کو مرے جو رکھتے ہیں حیراں بہار میں
اب کے تو مضطرب ہے بہت جاں بہار میں
یعنے ہے شغلِ ماتمِ جاناں بہار میں
اب کے بھی دِن بہار کے یونہی گذر گئے!

روتا ہوں گل کے خندۂ پیہم کو دیکھ کر
کم مائیگیِ گریۂ شبنم کو دیکھ کر
کہتا ہوں چشمِ نرگسِ پُرنم کو دیکھ کر

یہ بھی ہے اشکبار مرے غم کو دیکھ کر
اب کے بھی دن بہار کے یونہی گذر گئے!

کیا پاس خیز عالم صبح بہار ہے
گل روبرو ہیں اور نہاں روئے یار ہے
تیر نسیم سینۂ محزوں کے پار ہے
کیسی بہار یہ مرے پروردگار ہے
اب کے بھی دن بہار کے یونہی گذر گئے!

رونق ہجومِ بلبل و گل سے چمن میں ہے
آہنگِ چنگ و جام ہر اک انجمن میں ہے
لیکن کمی کہاں مرے رنج و محن میں ہے
سوزِ نہاں سے آگ لگی جان و تن میں ہے
اب کے بھی دن بہار کے یونہی گذر گئے

آب و ہوائے دہر نے پائی شگفتگی
ذرّوں پہ خاکِ مُردہ کے چھائی شگفتگی
گلزار میں ہے تازہ نوائی شگفتگی
لیکن ہمارے کام نہ آئی شگفتگی
اب کے بھی دن بہار کے یونہی گذر گئے!

ہر اک روش صبا کی عروسانہ چال ہے
جو نخل ہے ریاضِ جہاں میں نہال ہے
دِل آہ! مثلِ سبزہ مرا پائمال ہے
اب کے برس بھی موردِ رنج و ملال ہے
اب کے بھی دن بہار کے یونہی گذر گئے!

کیا فیض تیرے دم سے نسیمِ سحر ملا
غنچہ کبھی نہ دِل کا بانداز گُل کھِلا

اپنا نصیب تھا یہی - موسم کا کیا گِلا
ہر سال حسبِ حال ہمارے ہے یہ دِلا
اب کے بھی دن بہار کے یونہی گذر گئے!

محرومِ مُدّعا رہے باغِ جہاں میں حیف!
گذری بہارِ عُمرِ غمِ جاوداں میں حیف!
پایا نہ فرق ہم نے بہار و خزاں میں حیف!
ہیں صرف دِل کے حوصلے آہ و فغاں میں حیف!
اب کے بھی دِن بہار کے یونہی گذر گئے!

دِلکش گلاب ہے - نہ سمن دلپذیر ہے
گل داغ دِل ہے خار کلیجے کا تیر ہے
شعر و سخن میں ذکرِ چمن ناگزیر ہے
وردِ زباں یہ مصرعۂ استادِ میرؔ ہے

اب کے بھی دن بہار کے یُوں ہی گذر گئے!

ناپائدار رشتے

کتنے ہی اُستوار ہوں ٹُوٹیں گے ایک دن
رشتے یہ جتنے الفت و مہر و وفا کے ہیں
یہ مادر و پدر زن و فرزند و اقربا
شب بھر کے میہماں ہیں مسافر سرا کے ہیں
اطرافِ مختلف سے نکل آئے ہیں یہاں
ٹھیرے سرائے دہر میں اک جا پہ آ کے ہیں
مل جُل کے جائیں گے نہ بہم ہو کے آئے تھے
رستے نہاں نظر سے حیات و فنا کے ہیں

آب وہوائے دہر کی تاثیرِ اُنس سے
پابستہ یہ علایق بے انتہا کے ہیں
اِک دوسرے کے ساتھ لپٹتے ہیں پیار سے
تجدید پر گھڑی گھڑی پیماں وفا کے ہیں
چاہت کا وہ طلسم سمایا ہے آنکھ میں
عمرِ دو روزہ پر انہیں دھوکے بقا کے ہیں
سُنتے نہیں کہ پنبۂ غفلت بگوش ہیں
نقارے گرچہ بج رہے سر پہ فنا کے ہیں
پِستے ہیں جن میں آدمی نظروں کے سامنے
ارض وسما دو پاٹ اُسی آسیا کے ہیں

محرومؔ یہ تو مجھ کو بھی معلوم ہے کہ ہم
جو کچھ ہیں چلتے پھرتے کھلونے قضا کے ہیں

کرتا ہُوں میں تو صبر بھی اور دل پہ جبر بھی
اشکوں کو کیا کروں کہ یہ خود سر بلا کے ہیں!

سوزِ دل

پھر دلِ سوختہ مصروفِ فغاں ہوتا ہے
ذکرِ سوزِ غم و اندوہِ نہاں ہوتا ہے
کچھ خبر ہے تجھے شمشان کو جلنے والے!
سوزِ فرقت سے بُرا حال یہاں ہوتا ہے
خالقِ پاک تری رُوح کو ٹھنڈا رکھّے
محوِ فریاد ترا سوختہ جاں ہوتا ہے

صبحدم یاد مجھے تیری چتا آتی ہے
شعلۂ سرخ جو مشرق میں عیاں ہوتا ہے
اور ہر شام تری رونقِ طلعت کے بغیر
غمکدے میں مرے وحشت کا سماں ہوتا ہے

مری آہوں سے بوئے داغِ جگر آتی ہے
لختِ دل ساتھ لئے اشک رواں ہوتا ہے
ہے مرے واسطے اب گلشنِ عالم گلخن
ہر گلِ تر پہ شرارے کا گماں ہوتا ہے

آنچ سے آتشِ ہجراں کی ہوئی وہ صورت
جیسے تفسیدہ کوئی برگِ خزاں ہوتا ہے
پھیل جاتی ہے سرِ شام جو دھندلاہٹ سی
مہ جبیں! وہ مری آہوں کا دھواں ہوتا ہے

وہ نہیں رنگِ شفق۔ اوجِ فلک پر جا کر
نَفَسِ گرم مرا شعلہ فشاں ہوتا ہے

آستیں میں ہے نہ دامن میں، لگی ہے دِل میں
عزم کس سمت کا اے اشکِ رواں ہوتا ہے

تپشِ داغ سے کرتی ہیں وُہی کام آہیں
آگ پر جو اثرِ بادِ وزاں ہوتا ہے

تھا جلانا تو مجھے شمع بنایا ہوتا
یا وہ پروانہ جو محفل میں تپاں ہوتا ہے

مجمرِ دہر میں کیا خوب ہے مقسومِ سپند
یہ سلگتے کا عذاب اس کو کہاں ہوتا ہے

آج مخمور نکالے ہیں بہت گرم اشعار
دِل جلوں کا یہی اندازِ بیاں ہوتا ہے

روزے کہ سیہ شد سحر و شام ندارد

تضمین

ارمانِ وصالِ بُتِ گلفام ندارد
ذوقِ گلِ رخسارِ دلِ آرام ندارد
ہیچ از ہوسِ نامہ و پیغام ندارد
گفتیم بدل ایں طمعِ خام ندارد
نومیدئے ما گردشِ ایّام ندارد
روزے کہ سیہ شد سحر و شام ندارد

اب خنجرِ حسرت سے میں بسمل نہیں ہوتا
ابرُو کا تصوّر بھی مقابل نہیں ہوتا،

روتے پہ شبِ ہجر بھی مائل نہیں ہوتا
بےچین سحر کے لئے اب دل نہیں ہوتا
نومیدئ ما گردشِ ایّام ندارد
روزے کہ سیہ شد سحر و شام ندارد

پیکانِ تمنا نہیں جاتا ہے جگر تک
خوں نابِ دل آتا نہیں اب دیدۂ تر تک
رہتا نہیں میں گوش بر آوازِ سحر تک
اُٹھتی نہیں مشرق کو دمِ صبح نظر تک
نومیدئ ما گردشِ ایّام ندارد
روزے کہ سیہ شُد سحر و شام ندارد

تڑپا نہ دلِ کشتۂ صمصامِ جُدائی
بیحس ہے تہِ کثرتِ آلامِ جدائی
ایام ہیں اب زیست کے ایامِ جدائی
ہے صبح شبِ ہجر بھی یاں شامِ جدائی
نومیدئے ما گردشِ ایام ندارد
روزے کہ سیہ شد سحر و شام ندارد

عالم میں بدلتا رہے اوقات کا عالم
رہتا ہے یہاں تو وہی ظلمات کا عالم
دیکھا نہیں امیّد کے لمعات کا عالم
پیش نظر اپنے ہے وہی رات کا عالم
نومیدئے ما گردشِ ایام ندارد
روزے کہ سیہ شد سحر و شام ندارد

رُباعیات

(۱)

دے کر افسوس! دردِ پہلو مجھ کو
کیوں چھوڑ چلا نگارِ خوشخو مجھ کو
رونے دے مجھے۔ کہ ہوگیا مَیں برباد
دھوکا اے واہمہ! نہ دے تُو مجھ کو

(۲)

مقسوم میں تھا یہی ہمارے غم دَرد
ہوتا محروم کس طرح سے کم دَرد

یارب ! نہ کسی سے یوں جدا ہو جائے
ہمدم - ہمراز و ہمنشین و ہمدرد

(۳)

دل خوں ہے وہ انقلاب دیکھے ہیں نے
دنیا میں بہت عذاب دیکھے ہیں نے
تسکین دیتا ہوں دل کو اب یہ کر
وحشت انگیز خواب دیکھے ہیں نے!

(۴)

اک دل میں ہزار پیچ و تاب اے وائے!
یہ زندگی ہے - کہ ہے عذاب اے وائے!
مُردوں کو لحد میں یہ سکون یہ آرام
زندوں کے لئے یہ اضطراب اے وائے!

(۵)

آہیں وہی اور اشکباری ہے وہی
ابرِ آلام دِل پہ طاری ہے وہی
مُردہ ہوں کہ لُطفِ زیست سے ہوں محروم
زندہ ہوں کہ دِل کی بیقراری ہے وہی

تضمین

تا بہ آغوشِ فنا دیدم نگارِ خویش را
در تہِ ہر ذرّہ میجویم مزارِ خویش را
مے فریبم طالع ناسازگارِ خویش را
ہر زماں گویم دلِ اُمّیدوارِ خویش را

"آہ! من گر باز بینم روئے یارِ خویش را
تا قیامت شکر گویم کردگارِ خویش را!"

قطعہ

مر گیا دل اور دل کے حسرت وارماں تمام
یعنے اب باقی نہیں کوئی خوشی میرے لئے
پُر عذابِ مرگ سے ہے لحظہ لحظہ عُمر کا
زندہ رہنا ہے جہاں میں خودکشی میرے لئے

قطعہ

ہوئے رو پیٹ کر خاموش آخر
بظاہر ہو چکا ماتم کسی کا
مگر دنیائے فانی میں ہوں جبتک
دلِ بیتاب ہے اور غم کسی کا

تقریبات

سلام وپیام

(فخر پنجاب ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبال ایم۔ اے بیرسٹر ایٹ لا
کے ولائیت سے ہندوستان تشریف لانیکے موقع پر لکھی گئی)

آنا ترا مبارک! یورپ سے آنیوالے!
احبابِ منتظر کو صورت دکھانے والے
آنا ترا مبارک! اعزاز پانے والے!
ہندوستان کی عظمت عزت بڑھانے والے
آنا ترا مبارک! یا صد ہزار شوکت
مُلکِ سخن میں اپنا سکہ بٹھانے والے

آنا ترا مبارک! او بلبلِ خوش الحاں
نظمیں سُنانے والے! تانیں اُڑانے والے
آنا ترا مبارک! او فخرِ بزمِ قومی
ہنسنے ہنسانے والے! روتے رلانیوالے!
منظور کیجیئے گا پہلے سلام میرا!
خدمت میں آپ کی ہے پھر یہ پیام میرا
محفل میں رنگِ الفت اے شیخ! پھر جمادے
لایا فرنگ سے ہے جو مَے وہی پلادے
پھر ہو رہی ہے اَن بَن کچھ شیخ و برہمن میں
ان کو گلے ملا دے! روٹھے ہوئے منادے!
ہو برہمن نمازی۔ زاہد ہو یا سے بُت پر
دَیر و حرم کو ایسی ترکیب سے ملادے

کلمہ پڑھیں ترا سب۔ ہو کفر دُور دل سے

ناقوس پھونک ایسا۔ ایسی اذاں سُنا دے

مشہور کشوروں میں ہے سوز و ساز تیرا

اہلِ وطن کو اپنے اس راز کا پتا دے

سوتوں کو ہے جگانا۔ مُردوں کو ہے جِلانا

ہوگا یہ کام تجھ سے۔ ہمّت تجھے خدا دے!

سوزِ سخن بھی ہے گر دنیا میں چیز کوئی

اس کا اثر دکھا دے۔ اِک آگ سی لگا دے

منزل کٹھن ہے اپنی۔ اور پُر خطر ہیں راہیں

پھر سینکڑوں دو راہے۔ اک راہ پر چلا دے

سحرِ سخن سے اپنے تسخیر کر دلوں کو

نغمہ کوئی سنا دے! جادو کوئی چلا دے

قسمت سے ہے دلوں پر حاصل تجھے حکومت
جس کو ترس رہے ہیں دنیا کے شاہزادے!
بھارت ہماری ماں ہے۔ لازم ہے اسکی سیوا
کیا چاہیے ہمیں گر خوش ہو کے یہ دعا دے
ہل جائے دِل زمیں کا اور چرخ کانپ اُٹھے
اے نوجواں کڑک کر بجلی کوئی گرا دے!

دی ہے زباں بھی تجھ کو دل بھی دیا خدا نے
حُبِّ وطن کے دلکش پھر چھیڑ دے ترانے!

اک بار پھر سنا دے "ہندوستاں ہمارا"
اپنی زباں میں کہہ دے رازِ نہاں ہمارا
پھر زمزموں سے اپنے آباد اس کو کر دے
تیرے بغیر سُونا تھا گلستاں ہمارا

تھے تیری جستجو میں بن بن کی خاک اُڑاتے
بادِ بہار اپنی ۔ آبِ رواں ہمارا
کیا حال ہے وہاں کا۔ آتا ہے تو جہاں سے
کچھ تذکرہ سُنا بھی تو نے وہاں ہمارا
ہم چل پڑے ہیں لیکن منزل ابھی ہے کوسوں
اور سخت مشکلوں میں ہے کارواں ہمارا
اپنوں کی سرد مہری نے دل جلا دیا ہے
پہنچیگا آسماں تک دُودِ فغاں ہمارا
اقبال! دیکھ اتنا کوئی نہیں سمجھتا
مٹنے کو ہے جہاں سے نام ونشاں ہمارا
آپس کی دشمنی کے یہ دن نہیں ہیں ہرگز
پہلے ہی جبکہ دشمن ہے آسماں ہمارا

یہ وقت ہے کہ کہدیں سب ہو کے یکزباں ہم
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

گنگا میں جا پڑا ہے جس دن سے رام[1] اپنا
اونڈھا پڑا ہوا ہے اے شیخ! جام اپنا

پیام شوق

(اپنے ایک دوست مقیم لنڈن کے نام)

سروِ دلجو[2]! مجھ کو حیرت تھی تو کس گلشن میں ہے
ہوگیا معلوم بارے آجکل لندن میں ہے

---

[1] سوامی رام تیرتھ آنجہانی ۱۲۔

[2] یہ لفظ محض گلشن کی رعایت سے نہیں بلکہ مکتوب الیہ پر بلحاظ قد و قامت صادق آتا ہے۔ (محروم)

آجکل لنڈن میں ہے ہندوستاں سے دُور ہے

چشمِ مشتاقِ تماشا! وہ یہاں سے دور ہے

دُور ہے اور دُور بھی اتنا کہ اے پیکِ خیال

تو سریع السیر کتنا ہو رسائی ہے محال

راہ میں حائل ہیں کتنے بحر اور کتنے پہاڑ

کتنے میداں پُر فضا کتنے بیاباں ہیں اجاڑ

ختم ہو جاتی ہے مغرب میں جہاں جا کر زمیں

بحرِ اطلانطک میں چھوٹا سا جزیرہ ہے وہیں

وہ جزیرہ مسکنِ دانشورانِ دہر ہے

حکمت آموزِ جہاں لنڈن اک اسکا شہر ہے

مجھ کو جس کی جستجو تھی وہ اسی لندن میں ہے

ہند کا سروِ رواں انگلینڈ کے گلشن میں ہے!

ایک رونق یاب ہیں تجھسے سفر کی منزلیں
خیریت سے کر گیا طے بحر و بر کی منزلیں؟

ہمّتِ مردانہ ذوقِ علم دو شہپر ترے
لیگئے تجھ کو اڑا کر بن گئے رہبر ترے

ہو تری پرواز طلعت بخشِ افلاکِ علوم
راس ہو تجھ کو ہوائے خطّۂ پاکِ علوم

شوق سے کسبِ ضیائے آفتابِ علم کر
اپنی ہستی کو سراپا ماہتابِ علم کر

آکے یورپ سے چمک جا آسمانِ ہند پر
جس قدر ہو نور برسا خاکدانِ ہند پر

روشنی میں ہو اضافہ تاکہ تیری ذات سے
پار بیڑا ہند کا ہو قلزمِ ظلمات سے!

میرے پیارے ہم سبق! میرے پرانے ہمخیال
محو ہو سکتا نہیں دل سے ترا نقشِ جمال!
دل نشیں صورت تیری خاطر نشاں سیرت تری
اک امانت دل میں ہے الفت تری عزّت تری

اے عزیزِ خاطرِ احباب تو شاداں رہے
اجنبی ملکوں میں تجھ پر سایۂ یزداں رہے
اپنے ہم چشموں میں حاصل سرخروئی ہو تجھے
کامیابی کا نظر آئے رخِ نیکو تجھے!

مایۂ نازِ وطن ہو کر وطن میں آئے تو!
نو بہارِ جاں فزا ہو کر چمن میں آئے تو!
یوں رکھے پہلو میں تو اپنے دلِ پاکیزہ کو
رکھتے ہیں ماں باپ جیسے ہند میں دوشیزہ کو

حُسنِ انگلستان کے نظارہ ہائے دلفریب
چھین لیجائیں نہ پہلو سے ترے صبر و شکیب
تیری نظروں میں نہ ہو اعجاز جادو حُسن کا
تو نہ دیکھے لاکھ ہو زرّینہ آہوئے حُسن کا
دامِ گیسوئے طلائی میں نہ اُلجھے دل ترا
تو نہ ہو قائل اگر صیّاد ہو مائل ترا!
سنتے ہیں، مغرب میں شغل بادہ نوشی ہے بہت
رونق بازار رسم عیش کوشی ہے بہت
میکشی کا تیری محفل میں نرالا طور ہو،
بادۂ حُبِّ وطن کا یعنی چلتا دور ہو

---

[1] رامائن کے مایا کے ہرن کی طرف اشارہ ہے ۱۲

یاد آجائے کُرم[1] تجھ کو کنارِ ٹیمز پر
اور دو آنسو بڑھا دے جوئبارِ ٹیمز پر

یہ دعائیں ہیں مری، ان کو نصیحت مت سمجھ
جذبہ ہائے دل کو سرکی قابلیت مت سمجھ!

سہرا

زیب دیتا ہے نہایت ترے سر پر سہرا
ہے دعا تجھ کو مبارک ہو منوہر[2] سہرا

---

[1] دریائے سندھ کا ایک معاون ہے بنوں کے پاس سے ہو کر گزرتا ہے۔ مکتوب الیہ بنوں کا باشندہ ہے اور مخدوم کا کلاس فیلو۔

[2] لالہ منوہر لال برادر لالہ ٹیک چند بی۔ اے۔ بی۔ ٹی ڈیرہ اسمٰعیل خان

آج وہ دن ہے گل و گوہر و اختر از خود
پاس نوشہ کے چلے آتے ہیں بنکر سہرا

دیوتا پھول نہ کیوں آج فلک سے برسائیں
خود بنا لائے نہ کیوں نذر کو اندر سہرا

کیوں نہ خورشید و قمر۔ بامِ فلک سے جھانکیں
کب ہوا ایسا ستاروں کا میسّر سہرا

ہمسرِ چرخ بریں آج زمیں ہے بیشک
کہ دکھاتا ہے فروغِ مہ و اختر سہرا

بحر میں لہر خوشی کی ہے۔ گلستاں فرحاں
کہ بنا لائے ہیں لیکر گل و گوہر سہرا

گلشنِ دہر میں تو قیر قزائے گل ہے
مایۂ نازِ چمن ہے یہ معطّر سہرا

باعثِ زمزمۂ بلبل ہے
کہ ہے شاداب کِن روئے گُلِ تر سہرا
ناز کر اپنی لطافت پہ نہ اے موجِ نسیم!
ہے کہیں تجھ سے یہ نازک تر و خوشتر سہرا
گرہِ خاطرِ ہر غنچۂ و گل کو کھولا،
مطربِ بادِ بہاری نے سنا کر سہرا
دیکھ کر سُن ہوئے یوں لوگ کہ کچھ سنتے ہیں
نغمۂ حُسن کا مصدر ہے سراسر سہرا
داد دیں گے تمہیں خود جوہریانِ معنی،
خوب لکھ لائے ہو محرومِ سخنور سہرا
یسکہ نوشاہ جواں بخت ہے ہوگا مقبول
غالبؔ و ذوقؔ کے سہروں کے برابر سہرا

نرگس کے پھول[1]

پھول نرگس کے ملے تازہ و شاداب مجھے
عین موسم میں ملا ہدیۂ نایاب مجھے!
دِل کھِلا ہوئے محبّت سے جو پایا ان کو
دیدۂ شوق نے آنکھوں سے لگایا ان کو
بھینی بھینی وہ بُوئے خوش ہے کہ سُبحان اللہ
برگ برگ اُن کا وہ دلکش ہے کہ سبحان اللہ

[1] مکرمی لالہ پرمانند باقی نے راولپنڈی سے نرگس کے پھول بذریعہ ڈاک بھیجے اس عنایت کے شکریہ میں یہ نظم لکھی گئی ہے۔ (محروم)

کیا لطافت ہے بھری پنکھڑیوں میں اُنکی
جلوۂ حسن پری پنکھڑیوں میں ان کی،
چھُوٹ کر باغ سے ہیں بعدِ سفر بھی تازہ
دستِ قدرت نے ملا رُخ پہ کچھ ایسا غازہ
خوب ان پھُولوں کے حق میں شُعرا کہتے ہیں
چشمِ معشوق جو کہتے ہیں بجا کہتے ہیں
نظر آجائے جو ہو جائیں کبھی چار آنکھیں
اُن سے اچھی تو نہیں ہوتی ہیں بیمار آنکھیں
طالبِ دید سے دم بھر میں جو آنکھیں پھر جائیں
سامنے اُنکے وہ نظروں سے نہ کیونکر گر جائیں
نیمباز اُن میں کوئی، کوئی خمار آلُودہ
اُن کے ہر رنگ میں نیرنگِ بہار آلُودہ

ان کا باطن جو طلائی ہے تو ظاہر سیمیں
قیمتِ حسن میں ان سے کوئی گل بڑھ کے نہیں
ایک ہی جلوے سے سورج کی کرن بھی پیدا
مہ جمالوں کے کرشموں کا چلن بھی پیدا
لالہ کیا سامنے آئے کہ ہے داغِ گلشن
ان کو خالق نے کیا چشم و چراغ گلشن
روئے خوب ان کو گلاب آکے دکھلائے اپنا
پہلے دامن تو وہ کانٹوں سے چھڑائے اپنا
تھوڑی تھوڑی ہوئی جاتی ہیں سمن کی کلیاں
کہ بہت بڑھ کے ہیں نرگس کے چمن کی کلیاں
خوش نصیبوں کے وطن میں وطنِ نرگس ہے
شامّہ مستِ ہوائے چمنِ نرگس ہے

خوش رہیں گلشن عالم میں جنابِ باآلی
گلفشاں نخلِ تمنّا کی ہو ڈالی ڈالی!
پھول بھیجے ہیں اُنہوں نے بصدالطاف وکرم
ورنہ محرومؔ کی قِسمت میں تو ہے خارِ الم!

دہلی میں کیا دیکھا؟

برنگِ کاہ کھنچ کر برقؔ کی جانب گئے دہلی
کہ اُن کو جذبِ اُلفت میں مثالِ کہربا دیکھا
دلِ محرومؔ نازاں ہے کہ جن سے راہ تھی اُس کو
انہیں سرتاقدم مجموعۂ صِدق وصفا دیکھا

جنابِ مہر کے دیدار سے آنکھیں ہوئیں روشن
نگاہِ واقفِ معنی کو برقِ ما سوا دیکھا
ملے کیفی و رونق سے۔ سُنے اشعار بھی اُن کے
ابھی پردوں میں گوش و چشم کے ہے جو سُنا دیکھا
گزر اپنا ہوا بزمِ قصیرِ نکتہ پرور میں
وہاں پر بھی درِ گنجینۂ معنی کھُلا دیکھا
وفائے خضر صورت کی نہ بھولیگی ہمیں شفقت
بقا آبادِ ذوقِ دل کا ان کو رہنما دیکھا!
بزرگِ زندہ دل، رنگیں مزاج و نکتہ سنج ایسا
کہیں دیکھا نہ تھا۔ دہلی میں ہم نے انکو جا دیکھا
وفا صاحب کی پیری پر جوانی کیوں نہ ہو صدقے
انہیں جو نچُال پیری میں جوانوں سے سوا دیکھا

ملے یوں مجھ سے گویا ہمدمِ دیرینہ تھے سارے
غرض احبابِ دہلی کو محبت آشنا دیکھا
کئی حضرات سے ملنے کی خواہش رہ گئی دلمیں
اثر تیرا وہاں بھی ہم نے بختِ نارسا دیکھا
نہ آثارِ کہن دیکھے۔ نہ گلزار و چمن دیکھے
دلِ افسردہ کو اُفتادگی میں نقشِ پا دیکھا
یہی اشعار محروم حزیں اُن کو سُنا دینا
جو پوچھیں مہربانانِ وطن۔ دہلی میں کیا دیکھا!

جو تجھے منظور ہمکو اے خدا منظور ہے!

تیری مرضی کو خدائے پاک! کیا منظور ہے
جنگ شاہوں کو پسند اور صلح نامنظور ہے

دعوئے امن واماں اب ہے کہاں آدورِ امن
فتنہ انگیزی جہاں کو جابجا منظور ہے

آسماں نے لی ہے قدرت سے قبائے نیلگوں
شوقِ ماتم ہے اسے کس کی بقا منظور ہے

نیزہ دارِ خاور آتا ہے بصد جوشِ غضب
اس کو بھی ہنگامۂ گرم وِغا منظور ہے

بندہ محروم کو دم مارنے کی تاب کیا
جو تجھے منظور، ہمکو اے خدا منظور ہے،

قصیدہ

مشتمل بر

مدحتِ علم و مذمتِ جہالت

جو

رام موہن برائے ہائی سکول میانوالی کے افتتاحی جلسہ میں پڑھا گیا

دلِ افسردہ اپنا مائل جوشِ مسرت ہے
مُرادوں کے چمن پر سایہ گستر ابرِ رحمت ہے

میانوالی کے صحراؤں میں ہے رنگِ چمن پیدا
وطنِ مخدوم کا خجلت دہِ گلزارِ جنّت ہے
چمن بندانِ نونجاب سے تشریف لائے ہیں
بہارِ جاوداں کو جنکے مقدم سے لطافت ہے
لگانے آئے ہیں گلشن نیا اک علم و دانش کا
مبارک اے میانوالی! یہ جاں افزا بشارت ہے
برستا خطۂ بنگال سے ابرِ بہار آیا
کہ تیری سرزمیں لب تشنۂ بارانِ رحمت ہے
خیابان ہونگے اکدن علم و تہذیب و تمدن سے
یہی تیرے بیاباں جن سے وحشت کو بھی وحشت ہے
یہ ٹیلے ریت کے ہونگے گُلِ شاداب کے تختے
بہار انگیزان روزوں نگاہِ فیضِ قدرت ہے

نسیمِ رُوح پرور لائی ہے پیغام بیداری
سرِ بالیں جگانے کو کھڑی صبحِ سعادت ہے
توجّہ ہو گئی جب سے اے پی اور ڈی جے بانڈ کی،
تجھے یہ عہدِ علم افزا غنیمت ہے غنیمت ہے
خلیق و مہرباں دونو۔ شفیقِ بیکساں دونو
یہ وہ حاکم ہیں جن کو پاس بہبودِ رعیّت ہے
یہ وہ انگریز ہیں برطانیہ خود جن پہ نازاں ہے
خوشامد سے نہیں کہتا ہوں۔ اظہارِ حقیقت ہے
کرم سے آج ان کے کھُل گیا یہ مکتبِ قومی
اسی سے کھُل گئی اہلِ میانوالی کی قسمت ہے
جو مکتب کھولتا ہے بند کرتا ہے درِ زنداں
بجا ہے یہ جو انگریزی میں مشہور اک کہاوت ہے

مبارک روز ہے نوروز ہے یہ سال بکرم کا
نمایاں غیب کے پردے سے از خود شبھ مہورت ہے
وہ پاکیزہ پڑھوں اب علم کی توصیف میں مطلع،
کہیں جس کو سخنور گوہرِ دریائے فطرت ہے،
مبارک ہیں وہ انساں علم سے جنکو محبت ہے
کہ علم آئینہ دارِ پرتوِ روئے حقیقت ہے
اسی سے خاکیوں کے سینے ہوجاتے ہیں آئینے
یہی صیقل جہاں میں دشمنِ زنگِ کدورت ہے
دکھاتا ہے یہی عقبےٰ کی راہیں اور دنیا کی
یہی دو نو جہاں کیواسطے خضرِ طریقت ہے
پہنچتے ہیں اسی سے منزلِ مقصودِ عرفاں تک
یہی اکمل ریاضت ہے یہی افضل عبادت ہے

اسی سے رازِ ترکیبِ نظامِ دہر کھُلتا ہے
نظر آتی اسی سے خالقِ اکبر کی قدرت ہے
معزز ہیں زمانیمیں اسی سے پیشرو اپنے
اسی سے اُن کو حاصل امتیازِ اوّلیت ہے
ابھی تک اک جہاں ہے قایلِ ذہنِ رسا ان کا
جو پارینہ ورق ہے ہندیوں کا گنجِ حکمت ہے
کہا جاتا ہے گو پیغمبرِ اسلام کو اُمّی
مگر کیا خوب اُمّت کے لئے اُنکی ہدایت ہے
حصولِ علم کی خاطر اگر ہو چین تک جانا
پہنچ جاؤ وہاں تک۔ راستہ گو پُر صعوبت ہے
چلاتی ہیں بھروسے پر اسی کے کاروبار اپنا
وہ قومیں آج جنکے دستِ قدرت میں تجارت ہے

جہاں کے کارخانیں یہی استاد ہے پورا
بغیر اس کے مکمّل کوئی صنعت ہے نہ حرفت ہے
اسی کے زور پر قایم ہے ان کا کرّو فر سارا
میسر آج جن اقوام کو معراجِ شوکت ہے
فرنگستاں ہو، یا جاپاں ہو، امریکہ ہو، کوئی ہو
یہی قوموں کی عزّت ہے یہی ملکوں کی دولت ہے
درِ دولت پہ جا کر آتش و آب و ہوا تک ہیں
اسی کے بل پہ انساں کی عناصر پر حکومت ہے
فضیلت علم کی روشن ہے سب پر آفتاب آسا
اب اس مطلع سے تا مقطع جہالت کی مذمت ہے
جو انسان دہر میں پابندِ زنجیرِ جہالت ہے
جہاں اس کے لیے اے دوستو! زندانِ ذلت ہے

منوّر شمع دانش سے جب نہ ہو کاشانۂ دل میں
تو پھر دنیا میں دیکھو جس طرف ظلمت ہی ظلمت ہے
مکیں ہے تا بہ آخر چار دیوار عناصر میں
خیالِ خام ناداں کو نہ رفعت ہے نہ وسعت ہے
جو منظر جرأت افزا ہیں خرد کی چشم بینا کو
جہالت کے لئے اُنمیں ہر اک وسیلۂ ہیبت ہے
کسی سے کم ہیں افریقہ کے وحشی آدمیت میں
اگر دو پاؤں پر چلنا ہی شرطِ آدمیت ہے
جہالت خوابِ غفلت ہے جو جاہل ہیں سو غافل ہیں
نتیجہ خوابِ غفلت کا تاسّف ہے ندامت ہے
سقر اور صحبتِ عالم کی خواہش کرتے ہیں دانا
میسّر اُن کو جنت میں اگر جاہل کی صحبت ہے

وطن میں داغ ہے توقیرِ دامانِ وطن پردہ
سفر میں مردِ جاہل باعثِ تحقیرِ ملت ہے
دئے گنجے کو ناخن طالعِ ناساز نے گویا
اگر بےعلم کو دنیا میں حاصل گنجِ دولت ہے
زوالِ بخت کی تصویرِ عبرت جانئے اس کو
ہمارے ملک میں جاہل امیروں کی جو حالت ہے
نہیں ہے اس سے بڑھ کر کوئی مصرف انکی دولتکا
تہاں زیرِ زمیں ہے یا نثارِ بزمِ عشرت ہے
یہ بنجاتے ہیں حاتم کے چچا ڈوموں کی محفل میں
یتیموں کے لئے کہدو تو شلِ دستِ سخاوت ہے
مشاغل وہ کہ شرمائے شرافت دیکھکر جنکو
مصاحب ان کے وہ انسانیت کو جن سے نفرت ہے

یہ اپنے زعم میں محفوظ بیٹھے ہیں لبِ ساحل

انہیں پروا ہے کیا۔ گر قوم غرقابِ فلاکت ہے

انہیں اے کاش! اتنا وقت پر معلوم ہو جاتا

کہ سر پر سب کے یکساں سایۂ ابرِ نحوست ہے

جہالت کی گھٹا ہندوستاں کے سر سے ٹل جائے

دعا محروم کی اے حاجبِ بابِ اجابت ہے

دربارِ دہلی کی آمد آمد

مژدہ اے دہلی کہ پھر جشن کے ساماں ہونگے
جلوہ افروز یہاں قیصرِ ذیشاں ہونگے
چشمِ مشتاق تھی خوکردۂ دیدارِ شہاں
اب نکلنے کو مچلتے ترے ارماں ہونگے
جمع ہونگے طرب و عیش و نشاط و عشرت
اَلم و رنج و غم و درد پریشاں ہونگے
ہند کے راجہ مہاراجہ و نواب تمام
پھر بصد شانِ تجمل ترے مہماں ہونگے

پھر نیا عالمِ شگفتگی دیکھیں گے ہم
پھر ترے کوچے بہ کردارِ گلستاں ہونگے

ترے اقبال کے تارے وہ بنینگے سارے
تاجِ شاہی میں جواہر جو درخشاں ہونگے

تری قسمت کی سیاہی کو مٹانے کے لئے
نظر افروزِ مہ و مہر چراغاں ہوں گے

اثرِ جلوۂ دربار سے وہ ویرانے
جو کسی عہد میں شاہوں کے شبستاں ہونگے

اور اب جن کے مکیں زیرِ زمیں سوتے ہیں
وہ مکیں جن کے لئے عرش پہ ایواں ہونگے

عالمِ نور و ظہور ان میں نظر آئیگا آج
کہ جسے دیکھ کے دل روحوں کے فرحاں ہونگے

مہ و انجم کا جو دربار ہے شائدِ فلکی
اسی دربار کے اجلال پہ نازاں ہونگے
دیکھنا پھر کہ خجل اوج سما پر کیا کیا
زحل و مشتری و زہرہ و کیواں ہونگے
ان کی نظروں میں سمائیگا نہ دربار فلک
دہلی دربار کے انداز پہ قرباں ہونگے
یہ وہ دربارِ معلّٰے ہے کہ اے اہلِ نظر!
اس کے جلووں پہ فدا انجم تاباں ہونگے
قابلِ دید یہ دربارِ ہمایوں ہوگا
جس کے دروازوں پہ جم مرتبہ درباں ہونگے
اور وہ صاحبِ دربار ضیا سے جسکی
مہ و خورشیدِ فلک نور بدا ماں ہونگے

جس سے کم حشمت و عدل و خرد و فکر میں
جم و اسکندر و کسریٰ و سلیماں ہونگے

بحر و بر جس کی اطاعت میں جھکاتے ہیں سر
اور یونہی جس کی رضا جوئی میں کوشاں ہونگے

جس کے اوصاف کی مدّاح ہے ساری دنیا
عرش پر بلکہ ملائک بھی ثنا خواں ہونگے

وہ نگہبانِ رعایا ہے زمانے بھر میں
فضل و الطافِ خدا اس کے نگہباں ہونگے

عہدِ پیشیں کے شہنشاہوں کے جشن و دربار
یاد تجھ کو بہت اے گردشِ دوراں ہونگے

ایسا دربار مگر تو نے نہ دیکھا ہوگا
بات یہ ان میں نہ ہوگی، نہ یہ ساماں ہونگے

ایک اک قوم سے مخصوص رہے وہ دربار
سب مگر اس میں طرب کوش بکیساں ہونگے

چرچ میں، دیر میں، مسجد میں دعائیں ہونگی
شاد عیسائی و ہندو و مسلماں ہونگے!

پھولے جاتے ہیں خوشی سے چمنِ ہند کے پھول
کہ نثارِ رہِ شاہنشہِ دوراں ہونگے

شاہ کے فیضِ گلِ نقش قدم سے اے ہند!
غیرتِ باغ جناں تیرے بیاباں ہونگے،

تیرے گلزار میں آئے گی بہارِ تازہ
کہ یہاں سرو ولایت کے خراماں ہونگے

لیکے آئے گی یہاں ماہ دسمبر میں بہار
مقدمِ شاہ میں موسم بھی شتاباں ہونگے

گرم دل گرمئ نظّارہ سے ہونگے سیّاح
کب وہ زحمت کشِ آزارِ زمستاں ہونگے

بللہ الحمد! کہ مغرب سے اٹھا ابرِ عطا
غلّہ کیا گوہرِ نایاب بھی ارزاں ہونگے

موتی برسائیگا وہ ہند پہ اے اہلِ وطن
اب سے بھی آپ سوا بندۂ احساں ہونگے

فیض دربارِ شہِ کشورِ آزادی سے،
مُرغِ پربستۂ صیّاد پر افشاں ہونگے

سنتے ہیں ہونگے اسیرانِ وطن بھی آزاد
اُن کی آزادی پہ محروم بھی شاداں ہونگے!

تہنیت دربار دہلی

مژدہ باد اے گلشنِ ہندوستاں!
آگئی تجھ میں بہارِ بے خزاں
کیوں بہارِ بے خزاں تجھ میں نہ آئے
ملتفت ہو جبکہ ایسا باغباں
باغبانِ بوستانِ عدل و داد
نخلبندِ گلشنِ امن و اماں
آفتابِ مشرقِ فرماں دہی
قیصرِ ذی جاہ شاہِ جم نشاں

مایۂ تزئینِ تختِ سلطنت
آئیۂ تمکینِ تاجِ ضو فشاں
یادگارِ ملکۂ وکٹوریا
زینتِ شاہی و فخرِ دُودماں
عرش رفعت جم حشم دارا خدم
چارج پنجم خسروِ گیتی ستاں
آستاں پر جس کی ہونیکو نثار
"رات دن گردش میں ہیں سات آسماں"
جلوہ افگن تختِ دہلی پر ہے آج،
تھی جو دہلی پائے تختِ راجگاں،
دہلئ مرحوم پھر زندہ ہوئی
شاہ کے آنے سے آئی تن میں جاں

اے خوشا دہلی ترا بختِ بلند
شاہِ عالی مرتبت ہے میہماں
منعقد تجھ میں ہے دربارِ شہی
دیدنی ہوگی یہ تیری عز و شاں
تجھ میں ہے وہ آفتابِ خسروی
فی المثل تو ہے جوابِ آسماں
منعکس ہو ہو کے نورِ انبساط
ہند میں پہنچا بہر سو بیگماں
آج تبت سے کماری تک ہوئی
موجِ برقِ عیش و عشرت کی رواں
ہند کا ہر شہر ہے آراستہ
ہر چمن ہر باغ ہے رشکِ جناں

جشنِ شاہی کی خوشی میں شاد ہیں
ہند کے سب کودک و پیر و جواں
ہر طرف ہنگامۂ عشرت بپا
ہر جگہ ہیں عید کی تیّاریاں
جھومتے ہیں جوشِ مستی میں نہال
نغمۂ عشرت نوائے طائراں
ہیں مناتے اکطرف ہندو خوشی
ہیں مسلماں اکطرف شادی کُناں
دیر و مسجد میں دعائیں ہو گئیں
از پئے جاہ و جلالِ مرزباں
خوانِ نعما ہے، مساکیں کے لئے
گرم پوشش بہرِ سرما خوردگاں

قیصری تمغے ملے اطفال کو

ساتھ ہی بانٹی گئیں شیرینیاں

ہر کہیں جلسے مُبارکباد کے،

ہر جگہ رنگِ وفا کوشی عیاں

ہر زباں پر ہے دعائے بختِ شاہ

ہر بیاں میں ہے صداقت کا نشاں

ہر لبِ واپر تبسّم کی ہے مَوج

ہر نظر سے فرحتِ دل ہے عیاں

ہر گلِ بشگفتہ میں بوئے وفا

ہر چمن میں نہر الفت کی رواں

ہے دعائے صبحدم محروم کی

سُن لے تو اے خالقِ ہر دو جہاں

ملکۂ میری و شاہ جارج پر
ہو تری رحمت کا سایہ سائباں
بخش شہزادوں کو تو عمرِ طویل
ہوں رعیت کے لئے آرامِ جاں
ہند کو اس عہد میں اے کردگار
غیب سے دیدے حیاتِ جاوداں

مادرِ مہجور

ایک سچّا واقعہ

کوئی دم کی میہماں ہوں جانِ مادر آؤ بھی
رہ گیا آنکھوں میں دم میرا اٹک کر آؤ بھی
جاں کنی کا وقت ہے اور جاں نکلسکتی نہیں
سینۂ سوزاں پہ ہے فرقت کا پتھر آؤ بھی
نزع کی گھڑیاں ہیں میری آنکھ بیچین ہے
آؤ بھی اب اے قرارِ قلبِ مضطر! آؤ بھی

دیکھکر تم کو نہ روؤں گی میرے نورِ نظر!
روتے روتے خشک ہیں اب دیدۂ ترآؤ بھی
اپنے اپنے گھر کو واپس ہوتے ہیں سب شام کو
اب تو شامِ عمر ہے میری کہیں گھر آؤ بھی
منتظر کبتک رہوں ۔ ٹالوں قضا کو کب تلک
منہ دکھاؤ گے گرفتارِ بلا کو کب تلک
رُوحِ مضطر ٹھوکریں کھاتی بھٹکتی جائیگی
آہ! اس دنیا کو جسمیں تو ہے تکتی جائیگی
خوں کے آنسو ہیں کفن میں بھی بہاتی جاؤنگی
حسرتِ دیدار آنکھوں سے ٹپکتی جائیگی!
دیکھ کر آغوشِ مہر مادری کو مراد
بے بسی ارتھی پہ میری سر پٹکتی جائیگی

بجھ نہ جائیگی جلا کر مجھ کو اے اہل جہاں!
ماںتا کی آگ محشر تک بھڑکتی جائیگی

دوسری دنیا میں بھی تیری جدائی کی انی
پہلوئے مجروح میں یونہی کھٹکتی جائیگی،

وائے مجبوری! کہ مرتی مادر مہجور ہے
اور بیچارہ پسر زندانئے مجبور ہے!

ضبط سے اب کام میرے لال! گزرا جائے ہے
کوئی دم میں آخری ہچکی کا جھٹکا آئے ہے

شانتی کی موت مجھ کو کاش! ہو جاتی نصیب
کیا کروں تیری جدائی کا قلق تڑپائے ہے

سہل ہو جائے کسی صورت نکلنا جان کا
کاش جھوٹوں ہی کوئی کہدے کہ اتو آئے ہے

آہ! بدلے آسماں نے مجھ سے کس دن کیلئے
آخری ساعت میں یہ صدمے مجھے دکھلائے ہے
آہ! مَیں سنتی ہوں تیرے نالۂ زنجیر کو
ورنہ کیوں لب پر مرے ہر وقت ہائے ہائے ہے
دو جگہ پر میری جانِ ناتواں مشکل میں ہے
کچھ یہاں مشکل میں ہے اور کچھ وہاں مشکل میں ہے
جانِ مادر! تجھ کو ملجاتی اجازت کاشکے
ڈالدیتا وہ کسی کے دل میں شفقت کاشکے
کاش! تو آرامِ جاں ہوتا نظر کے سامنے
جاں نکل جاتی بصد آرام و راحت کاشکے!
آہ! مجھ دکھیا کے نالے ہی پہنچ جاتے وہاں
اور ہوتی عرصۂ محشر عدالت کاشکے!

آہ! مرنا بھی ہے مشکل اور جینا بھی محال

آسماں دیتا نہ یہ دوگونہ دقت کا سے شکے!

بند ہو جانیکو، ہیں آنکھیں ہمیشہ کے لئے

دیکھ لیتی ہیں ترا مُنہ وقتِ رحلت کا شکے!

داغِ حسرت آہ! پہلو میں لئے جاتی ہوں میں!

کس طرف جاتی ہوں یا رب کس لئے جاتی ہوں میں!

پیغامِ شہنشاہی

زہے طالع! کہ پیغامِ شہِ ہندوستاں آیا
دِلوں کو شاد کرتا جُوں نسیمِ گلستاں آیا

کُلاہِ افتخارِ ہند پہنچی آسمانوں تک
پیامِ اَوج بخشِ فخرِ شاہانِ جہاں آیا

کھُلا تاریخِ ملکِ ہند میں نَو بابِ آزادی
نظامِ سلطنت بدلا نیا دورِ زماں آیا

اسیرانِ وطن قیدِ بلا سے یک بیک چھوٹے
کہ شاہنشاہ کا پیغامِ آزادی نشاں آیا

نئی جاں آگئی پھر بھارتِ مجروح کے تن میں
پیامِ شاہ ہو کر مرہمِ زخمِ نہاں آیا
ہمیں وکٹوریا کے خانداں سے تھی امید ایسی
کہ حُریّت کا حامی دہر میں یہ خانداں آیا
پڑھا محروم میں نے جب یہ پیغامِ شہنشاہی
زباں پر میری شکرِ خالقِ ہر دو جہاں آیا!

تقریظِ منظوم

بر مثنویِ سحر

اے سحر! فسوں طرازِ معنی!
اے صاحبِ امتیازِ معنی
لکھی ہے یہ تو نے مثنوی خوب
دلچسپ، نظر فریب، مرغوب!
یہ عشق کی داستانِ دلکش
اور اس پہ ترا بیانِ دلکش!

دکھلائے ہیں لطفِ فن سے تو نے
کیا حُسنِ کلام کے نمونے
دُشینت و شکنتلا کی رُوداد
ہے لائقِ صاد قابلِ داد
ارژنگِ سخن یہ مثنوی ہے،
یہ حُسنِ بیاں یہ شاعری ہے!
تصویرِ مناظرِ دل افروز
تسکین دہِ عاشقانِ دل سوز
آمد کے بہاؤ پر رواں ہے
دریائے لطافتِ بیاں ہے
جاں بخش بھی دلگداز بھی ہے،
ہے سوز بھی اس میں ساز بھی ہے

تمہید فراق جاں گزا ہے
تقریبِ وصالِ دِل فزا ہے

نغمے ہیں سرُور پاش اس میں
نالے ہیں جگر خراش اس میں

جلوے کہیں اس میں بزم کے ہیں
نقشے کہیں اِس میں رزم کے ہیں

امکاں کا ہے گو ظہور اُس میں
عرفاں کا بھی ہے سرُور اس میں

محرُوم زیادہ کیا لکھوں میں
زیبا ہے جو اس قدر کہوں میں

یہ نظم وہ ہے کہ جس کو سُن کر
ہو رُوحِ نسیم[۱] شاد یکسر!

[۱] منشی دیا شنکر نسیم مرحوم صاحب "گلزارِ نسیم" ۱۲

قطعہ

شملہ کے مشاعرہ ۱۹۲۵ء میں یہ قطعہ اپنی نظم
پڑھنے سے چند منٹ پہلے لکھا گیا۔ اور نظم سے پہلے
تمہیداً پڑھا گیا

کہاں ہم اور کہاں بزمِ ادیبانِ سخن پرور
طریق نغز گوئی راچہ داند مردِ صحرائی
کہاں شملہ کہاں دشت و بیابانِ میانوالی
تعجب خیز گرما میں ہوئے سامانِ سرمائی
دلِ افسردہ میں ذوقِ تماشا بھی کہاں اتنا
کہ بے برگ و نوائی کو نہ ہوتا وہمِ رسوائی

پہاڑوں کی بلندی دیکھنے گھر سے نکلتے کیوں
تخیّل کو میسّر کب نہیں تھی عرش پیمائی

نہیں محرومؔ باعث اور کوئی شملہ آنے کا
محبّت شیخ صاحب[۱] کی یہاں تک کھینچ کر لائی

اظہارِ غم

ایک نیکدل ڈاکٹر کی تبدیلی

مطلعِ دِل پہ اُداسی کی گھٹا چھائی ہے
شبِ ہجراں کی سیاہی سی نظر آئی ہے

پڑ گئی اوس یہ کیا شہر و چمن پر یا رب!
صورتِ مردم و گل کس لئے مرجھائی ہے

۱؎ شیخ سر عبدالقادر بالقابہ کے زیر اہتمام یہ مشاعرہ ہوا تھا ۱۲ (محرومؔ)

شہر ہیں منظرِ بیرونقئ صحرا ہے

سیرِ بازار ہے یا بادیہ پیمائی ہے

خندہ زن پھول گلستاں میں تھے کل تک پر آج

نوبتِ چاکِ گریبانِ قبا آئی ہے

سروِ گلزار میں کل تک تو جہاں تھے لیکن

دشمنِ مشقِ خرام آج گراں پائی ہے

بزمِ احباب میں رونق ہے نہ وہ جوش و خروش

یہ کوئی بزم ہے یا گوشۂ تنہائی ہے

الوداع آئے ہیں کہتے کسے احباب کہ آج

وقفِ صد مہرِ خموشی لبِ گویائی ہے

شعر کیا پڑھئے کہ ہر لفظ ہے اک دفترِ غم

وجہِ افسردگئ دل سخن آرائی ہے

ایک محبوب دلِ خلق کی رخصت کا دن

باعثِ رخصتِ ایّام شکیبائی ہے

تندرست آج ہیں بیمار کہ وہ جاتے ہیں

جاں سے بیمار ہیں بیزار کہ وہ جاتے ہیں!

دلِ رنجور تجھے چین بھلا کیا آئے

چارہ گر جبکہ نظر کوئی نہ اُنسا آئے

رائےصاحب کو خدا نے وہ دیا دستِ شفا

سامنے جس کے نہ ہرگز یدِ بیضا آئے

ایک دم میں رخِ بیمار پہ آئی رونق

آپ آئے سرِ بالیں کہ مسیحا آئے

سامنے آپکے سِل جاتے ہیں لبِ سکتے بھی

زخم جو سوزنِ تقدیر پہ ہنستا آئے

حکمت ایسی انہیں فیاضِ ازل نے بخشی
رشک سقراط کو آئے تو نہ بیجا آئے

ان فضائل پہ اضافہ وہ خصائل ہیں جنہیں
سیکھنے عرش معلّے سے فرشتہ آئے

صورت و سیرتِ مقبول جو دیکھے انکی
نظر اللہ کی قدرت کا تماشا آئے

ایسے انسان کہاں ملتے ہیں انسانوں میں
روح بنکر جو سما جاتے ہیں سب جانوں میں

جو نویدِ عمل صدق و صفا دیتے ہیں
فطرتِ قدسیۂ آدم کا پتا دیتے ہیں
شاخِ پُر میوہ کی مانند سعادت پاکر
گردنِ عجز سوئے خاک جھکا دیتے ہیں

سب کی نظروں میں سما جاتے ہیں ایسے انساں
تفرقے مذہب و ملّت کے مٹا دیتے ہیں
جسطرح دیکھتے ہو آج یہاں کا نقشہ
اپنی فرقت سے وہ لوگوں کو رُلا دیتے ہیں
رائیصاحب پہ رہے سایۂ الطافِ خدا
وہ دوا دیتے تھے ہم اُن کو دُعا دیتے ہیں
دہر میں پھولیں پھلیں، صاحبِ اقبال رہیں
اے خدا! خلق کے ہمدرد مہ و سال رہیں!

شامِ جدائی

(مفتی احمد سعید صاحب پی - اِی - ایس کی تبدیلی پر)

ہمیں دھڑکا تھا جس کا آگئی وہ غم کی شام آخر
سُنایا دورِ گردوں نے جدائی کا پیام آخر!

یہ ضد اے گردشِ دوراں! بھلا کیوں ہم غریبوں سے
جو نامنظور تھا ہم کو، کیا وہ تو نے کام آخر

سرشکِ خُوں نہ کیوں کر یادگارِ رنگِ محفل ہو
گیا وہ ساقئ رنگیں، ہوا وہ دَورِ جام آخر!

کسی کو راس دنیا میں نہیں بزمِ فراغ آئی
جو بیٹھا شادماں ہوکر، اُٹھا وہ تلخ کام آخر!

مسرّت کی فضا میں اے مقدر! کیوں اڑانا تھا
اگر کرنا تھا مرغِ دل کو بے کل زیرِ دام آخر

اگر انجام حسرت ہے ہر اک دیرینہ صحبت کا
تو کس برتے پہ ہیں دل سوز یوں کے اہتمام آخر

ہماری شاعری کا قدرداں تھا اک وہ جاتا ہے
گئے اب شعر کے چرچے، ہوا لطفِ کلام آخر!

چہ حسرت خیز شامِ رخصتِ احمد سعید آمد
کہ از ہر ذرّہ خاکے دلِ نالاں پدید آمد!

بچّوں کی موت

توڑتا ہے کس لیے غنچوں کو گلچینِ اجل
کس سے پوچھیں آہ! کیا ہے طرزِ آئینِ اجل

ننھے معصوموں کی جانوں پر عذابِ جانکنی
پھُول سے اجسام نذرِ التہابِ جانکنی
آہ! ہنستے کھیلتے خاموش ہو جاتے ہیں یہ
جس سے پھر اُٹھتے نہیں وہ نیند سو جاتے ہیں یہ
اپنے بیگانوں کا دل رہتا ہے جنسے باغ باغ
دیکھئے اُن کے جگر جنکو یہ دیجاتے ہیں داغ
تا دمِ آخر جدائی کے ستم سہتے ہیں وہ
مر نہیں جاتے ہیں پر زندہ نہیں رہتے ہیں وہ!
انکے اُجڑے باغ میں فصلِ بہار آتی نہیں،
گھر کے بام و در سے اُٹھتی ہے یہ فریادِ حزیں
"پھُول تو دو دن بہارِ جانفزا دکھلا گئے
حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھِلے مرجھا گئے"!

تضمینات

تہنیت نوروز

تضمین بر اشعارِ مکرمی منشی مہاراج بہادر برق بی۔ اے دہلوی

خورشیدِ سالِ نو ہے کہ ہے جامِ انبساط
کیا فالِ نیک ہے پئے ایامِ انبساط
آئینگے پے بہ پے سحر و شامِ انبساط
نوروز لے کے آیا ہے پیغامِ انبساط
ہو رشکِ صبحِ عید یہ روشن سحر مجھے!
جاں بخش تجھ کو دہر کی آب و ہوا رہے
باغِ جہاں میں نخلِ تمنا ہرا رہے

دل پر بہارِ تازہ کا عالم سدا رہے
دامن گُلِ مراد سے تیرا بھرا رہے
آمد ہو سالِ نو کی مسرّت اثر تجھے!

فرحت دہِ ریاضِ جہاں مثلِ نُور رہے
دم تیرا تازشِ چمنِ آرزو رہے
مانندِ گل شگفتہ دل و تازہ رُو رہے
محفوظ چشمِ زخمِ زمانہ سے تُو رہے
پہنچا سکے نہ تیغِ حوادث ضرر تجھے!

روشن دلی میں شمعِ سرِ انجمن ہو تو
آزادہ رَو مثالِ نسیمِ چمن ہو تُو
تازہ کُنِ مسرتِ بزمِ کہن ہو تُو
سرمستِ ساغرِ مئے حبِّ وطن ہو تُو

ہوں اس کے گھونٹ راحتِ قلب و جگر تجھے!

ہو کر فدائے اہلِ وطن شاد جی

ایسے میں موت آئے تو ہے اصلِ زندگی

حق سے ہے تیرے حق میں مری تو دعا یہی

خدمت میں تو وطن کی رہے محو بیخودی

اس کے سوا نہ آئے خیالِ دگر تجھے!

تیری نظر میں فکرِ کم و بیش ہو زبوں

کم بھی ملے تو شکرِ خدا و نہ ہو فزوں

گُل کی طرح نہ زر کے لئے دل ترا ہو خوں

حاصل تجھے متاعِ قناعت سے ہو سکوں

رکھے نہ مضطرب ہوسِ مال و زر تجھے!

ہر صبحِ سال نو ہو تجھے صبحِ نو بہار
ہر شام شامِ وصلِ عزیزانِ غمگسار
کلفت ہو دُور دل ہو مسرت سے ہمکنار
راحت ملے۔ ہولئے زمانہ ہو سازگار
راس آئے برقؔ کی یہ دعا، سربسر تجھے!

فردوسِ ہند

(تضمین بر شعر حضرتِ آزاد مؤلف خزانہ عامرہ)

طوبےٰ ہے ایک اک شجرِ گلستانِ ہند
کوثر ہے، سلسبیل ہے آب روانِ ہند

حُور و پری سے کم نہیں ہرگز بتانِ ہند
گر نیست از بہشت فزوں بوستانِ ہند
آدم زناز و نعمتِ جنّت چساں گذشت
ہمپایۂ ملائکہ تھے قدسیانِ ہند
شرمندہ سازِ جنّتِ ماوےٰ تھی شانِ ہند
کہتے ہیں لوگ اب بھی دمِ امتحانِ ہند
گر نیست از بہشت فزوں بوستانِ ہند
آدم زناز و نعمتِ جنّت چساں گذشت
جنت کی آرزو نہ کریں ساکنانِ ہند
مرکر بھی یہ دعا ہو کہ رہئے میانِ ہند
فردوس کیا ہے دوستو ایشِ جنانِ ہند
گر نیست از بہشت فزوں بوستانِ ہند

آدم ز ناز و نعمتِ جنّت چساں گذشت

امامِ ہند

(ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کے اشعار پر تضمین)

چلتا ہے دَور بادۂ عرفاں بکامِ ہند
ہیں واقفِ سُرورِ ازل خاص و عامِ ہند
بالا ہے بزمِ پیرِ مغاں میں مقامِ ہند
لبریز ہے شرابِ حقیقت سے جامِ ہند
سب فلسفی ہیں خطۂ مغرب کے رامِ ہند

وہ ہند کے بلند خیالانِ با خبر
رہتی تھی جن کی ہفت سماوات پر نظر
دیکھے پڑے تھے سب زحل و زہرہ و قمر
یہ ہندیوں کی فکرِ فلک رس کا ہے اثر
رفعت میں آسماں سے بھی اونچا ہے بامِ ہند!

دل کو نہ ہونے دیتے تھے شیدائے سنگ و خشت
انکی سرشت پاک سے تھا دور فعلِ زشت
یہ خطہ اس زمانے میں تھا واقعی بہشت
اس دیش میں ہوئے ہیں ہزاروں ملک سرشت
مشہور جن کے دم سے ہے دنیا میں نام ہند!

جس طرح ماہ و مہر کو ہے آسماں پہ ناز
اور نور پر ہے مہر و مہ ضو فشاں کو ناز

جس طرح درّ و لعل پہ ہے بحر و کاں کو ناز
ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز
اہل نظر سمجھتے ہیں اس کو امامِ ہند!
پھیلی جو آکے شمعِ صداقت کی روشنی
باطل کی راہ راہِ عدم ڈھونڈنے لگی
مدّت ہوئی، مگر ہیں ابھی جھلکیاں وہی
اعجاز اس چراغِ ہدائت کا ہے یہی
روشن تراز سحر ہے زمانے میں شامِ ہند!

تخلیقِ مقاصد

(تضمین بر شعر ڈاکٹر اقبال)

ماکہ ہر سُو روز و شب تازندہ ایم　　منزلے را در جہاں جویندہ ایم
تا نہ بر جویندہ و یابندہ ایم　　از وجودِ خویشتن شرمندہ ایم

ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم
از شعاعِ آرزو تابندہ ایم!

مقصدِ مہر و مہِ تاباں کو دیکھ　　مدّعائے انجمِ رخشاں کو دیکھ
فرضِ ابر و صرصر و باراں کو دیکھ　　پھر کمالِ مطلبِ انساں کو دیکھ

ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم
از شعاعِ آرزو تابندہ ایم!

یہ نہ کہیے مدّعا کوئی نہیں　　دل کو گھیرے مدّعا کوئی نہیں
جو نہ رکھے مدعا، کوئی نہیں　　دِل یہاں بے مدّعا کوئی نہیں

ما ز تخلیقِ مقاصد زُندہ ایم
از شعارِ آرزو تابندہ ایم!

بیدلی افسردگی اچھی نہیں　　جسم و دل کی کاہلی اچھی نہیں
بات ترکِ فعل کی اچھی نہیں　　بے مقاصد زندگی اچھی نہیں

ما ز تخلیقِ مقاصد زُندہ ایم
از شعارِ آرزو تابندہ ایم!

کیا پہاڑوں میں حجر بڑھتے نہیں؟　　یا کہ جنگل میں شجر بڑھتے نہیں
چرخ پر شمس و قمر بڑھتے نہیں؟　　حیف ہے انساں اگر بڑھتے نہیں

ما ز تخلیقِ مقاصد زُندہ ایم
از شعارِ آرزو تابندہ ایم!

مقصدِ اعلیٰ ہے اعلیٰ زندگی مقصدِ ادنیٰ ہے ادنیٰ زندگی
جب نہ ہو مقصد تو پھر کیا زندگی موت ہے یا بے تمنا زندگی
ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم
از شعاعِ آرزو تابندہ ایم!

جوئے نالاں

(سر اقبال کے ایک شعر کی تضمین)

انداختت دردم در رہگذاراں از چارہ رفتم اے چارہ کاراں!
ہم اشک ریزاں، ہم رہ سپاراں بے رازداراں، بے غمگساراں
"جانم در آویخت بار دگاراں
جوئے است نالاں در کوہساراں"!

آغاز نہاں، انجام پنہاں مشکوک وہ بھی جو کچھ نمایاں
راہِ سفر ہے بے حدّ و پایاں تشویق نالاں تحقیق حیراں

"جانم در آویخت با روزگاراں
جوئے است نالاں در کوہساراں"!

بیچارگی پر میری تبسّم! بالا نشینو! ہنستے رہو تم
تصویر کے نقش، ہیں ماہ و انجم ظاہر ہویدا، معنی مگر گم!

"جانم در آویخت با روزگاراں
جوئے است نالاں در کوہساراں"!

دَورِ مسلسل شام و سحر کا آیا کدھر سے؟ عازم کدھر کا
کچھ ہے بھی یا ہے دھوکا نظر کا؟ ساتھی بناؤں کس کو سفر کا؟

"جانم در آویخت با روزگاراں
جوئے است نالاں در کوہساراں"!

رنگیں ہیں نغمے، خونیں ہیں نالے — ہنس ہنس کے روتے ہیں سننے والے
بے ساز ہیں گل، بے سوز لالے — اک سُو ہے سبزہ دامن سنبھالے

"جانم در آویخت با روزگاراں
جوئے است نالاں در کوہساراں"!

بُت کے بندے

(تضمین بر شعرِ حضرت اکبر الہ آبادی)

مونسِ غم کوئی درخورِ تمنّا نہ مِلا
پئے بیمارئ دل کوئی مسیحا نہ مِلا
ہر بشر کہنے کو یاں عشق کا افسانہ مِلا
کوئی اے دردِ حقیقی! ترا جویا نہ مِلا

جس سے دل اپنا بہلتا کوئی ایسا نہ مِلا
بُت کے بندے ملے اللہ کا بندہ نہ مِلا

عاشقِ شوکت و اجلال و حشم ہیں لاکھوں
طالبِ تاج زر و طبل و عَلَم ہیں لاکھوں
اور جادُو زدہ نقشِ دِرَم ہیں لاکھوں
یونہی وارفتۂ اندازِ صنم ہیں لاکھوں

جس سے دل اپنا بہلتا کوئی ایسا نہ ملا ،
بت کے بندے ملے اللہ کا بندہ نہ ملا ،

دیر تو خیر اسیرانِ صنم کا گھر تھا
ہم نے کعبے میں بھی دیکھا تو یہی پتھر تھا
بات آخر وہی پیش آئی کہ جس کا ڈر تھا
یعنی وہ سنگ تھا اور خلقِ خدا کا سر تھا

جس سے دِل اپنا بہلتا کوئی ایسا نہ مِلا
بُت کے بندے ملے اللہ کا بندہ نہ مِلا

پرہیزگاری

دنیا میں آج حیف کہ بازارِ اتقا
گرمیِٔ مُسکرات کے باعث پڑا ہے سرد
رشیوں کی سرزمیں تھا یہ ہندوستاں پر آج
ملتا نہیں ہے ڈھونڈے سے پرہیزگار مرد
خوفِ خدا ہے دل میں نہ آنکھوں میں شرمِ ہر
اہلِ وطن کے حال پہ روتے ہیں اہلِ درد

شاعر ہیں کرتے پھرتے علانیہ وصفِ مے

ابلیس دلفریب ہوا ین کے سرخ و زرد

عقبےٰ کا کچھ خیال اگر تیرے دل میں ہے

لکھ لوحِ دل پہ بلبلِ شیراز کا یہ فرد

"پرہیز گار باش کہ دادارِ آسماں

فردوس جائے مردم پرہیز گار کرد"

سوئے دوست

(ایک فارسی شعر کی تضمین)

نا امیدی کی ہزاروں ٹھوکریں کھاتا ہوا

ان کے کوچے سے چلا میں دل کو سمجھاتا ہوا

مشعلِ دانش سے دکھلا تا طریقِ نیک و بد
اس گلی سے جا چکا ہے بارہا ناکام تُو
پھر بھی ہے محوِ فریبِ گردشِ ایّام تُو
ہو چکی رسوائیوں۔ ناکامیوں کی اب تو حد
ہو چکیں کتنی جفائیں تجھ پہ اے ناکامِ عشق،
مصلحت سے کام لے اور اب نہ لے تُو نامِ عشق
دامِ اُلفت سے رہائی کیلئے کر جہد و جد
دل نے برافروختہ ہو کر دیا ایسا جواب
بن نہ آیا مجھ سے کوئی اس کی باتوں کا جواب
مصرعۂ اوّل پہ چمپت ہو گیا پیرِ خرد
مجھ کو مقتل بھی ہے مامن بھی ہے ناداں کوئے دوست
"میگریزم از جفائے دوست لیکن سوئے دوست

چوں شرر خونم نہاں در تیغِ قاتل میشود

سخت ناداں

ذکرِ اورنگ زیبِ عالمگیر
شورش افزائے بزمِ ویران است
غصہ برکروہاش ہندو را
مسلم او را بدل ثنا خوان است
سُخنِ برہمن سناں تمثال
نفسِ شیخ شعلہ سامان است

اندرین حال قولِ ابن یمینؔ
درحق ہندو و مسلمان است

"ہرکہ با زندہ از پئے مُردہ
میکند جنگ سخت نادان است"

تضمین

(غزلِ جگر بریلوی)

موت اب باعثِ ہراس نہیں زندگی موجبِ سپاس نہیں
تا قیاس انتہائے یاس نہیں تم نہیں پاس کوئی پاس نہیں
اب مجھے زندگی کی آس نہیں!

دیکھئے موت رنگ کیا لائے وقفِ تسکیں کرے کہ تڑپائے
ڈر ہے وقتِ اخیر جب آئے کشمکش میں نہ روح پڑ جائے
یوں تو مرنے کا کچھ ہراس نہیں!

گو زباں پر ہے "ہر چہ باد اباد" مطمئن کب ہے خاطرِ ناشاد
کارِ دنیا ہُوا۔ نہ فکرِ معاد عمر سی عمر ہو گئی برباد
دلِ ناداں عبث اُداس نہیں!

ماتمی ہی فضائے دنیا ہے یا کوئی ہولناک صحرا ہے
ہر نفس دشمنِ تمنّا ہے سانس لینے میں درد ہوتا ہے
اب ہوا زندگی کی راس نہیں!

دامنِ زیست چاک ہو نہ یدے قصّہ ہوتا ہے پاک ہو نہ یدے
خاک کو تابناک ہو نہ یدے راہ میں اپنی خاک ہو نہ یدے
اور کچھ میری التماس نہیں!

آگ تھا آگ یہ دلِ مضطر نظر آتا ہے اب جو خاکستر
پوچھ محرومِ زار سے جاکر کیا بتاؤں مآلِ شوقِ جگر
آہ! قائم مرے حواس نہیں!

نہیں شکایتِ تزویرِ حاسدِ پُرفن
نہیں ہے شکوۂ بیدادہائے دَورِ زمن
عدوِّ عیش مقدّر، نہ آسماں دشمن
بُوَد بجرمِ ہنر جملہ تنگ عیشیِ من
گرہ چو آئینہ دارم بہ دل ز جوہرِ خویش

رُباعیّاتْ
و
قطعات
مرحوم

داد سخن از جناب اکبر الہ آبادی

رباعی

ہے داد کا مستحق کلامِ محروم
لفظوں کا جمال اور معانی کا ہجوم
ہے اُن کا سخن مفید و دانش آموز
انکی نظموں کی ہے بجا ملک میں دھوم!

شکریۂ دادِ سخن از محروم

رباعی

طبعِ موزوں خدائے برتر سے ملی
تاثیرِ کلام قلبِ مضطر سے ملی
آیا مجھکو یقیں کہ شاعر ہوں میں
جب دادِ سخن جنابِ اکبر سے ملی

رباعیات

۱

کیا ابر بہار جھوم کر آیا ہے
دامن میں لیے زمیں گھر لایا ہے
ابر و باراں پہ کسکو حاصل قدرت
رحمت تیری ہے جس نے برسایا ہے!

۲

ہنگامہ ترا ہی گرم ہر اک سو ہے
تیرے دم سے ہے جتنی ہا ہو ہے
دل سے پیہم یہی صدا اٹھتی ہے
تو ہی تو ہے جہاں میں تو ہی تو ہے!

۳

معدوم اسے نہ جان جو ہے مستور
ظلمت کے مقابلے میں موجود ہے نور
اے منکرِ ذاتِ حق! ذرا کھول آنکھیں
فانی ہم ہیں تو کوئی باقی ہے ضرور!

۴

دنیا میں برائے مردم کم مقدار
اہل شوکت ہیں باعث صد آزار
راہوں میں رہروانِ منزل کیلئے
اُڑتی ہوئی گرد چھوڑ جاتے ہیں سوار!

۵

اس سے تو دل و دماغ ہونگے ابتر
ہاتھ آئیگا کیا بہت کتابیں پڑھکر
آنکھیں روشن ہوں اور دل نورانی
ڈال ایک نظر صحیفۂ فطرت پر!

۶

اُڑ جائیگا رنگِ حُسن رنگیں آمیل!
دولت بھی نہیں ثبات آئین آمیل!
فانی اشیاء کی جب تلک ہے خواہش
حاصل ہوگی نہ تجھکو تسکیں اے دل!

۷

جو کچھ کہ ہے مستعار دیتی دُنیا
ہے وقت سفر سنبھال لیتی دنیا
دانا ہے تو تخمِ خیر بوئے جا تُو
آخر ہے آخرت کی کھیتی دنیا!

۸

جو تارکِ اسباب جہاں ہوتا ہے
غم اس کو دمِ مرگ کہاں ہوتا ہے
دنیا کو سمجھتا ہے سرائے کی طرح
خود مثلِ مسافر گزراں ہوتا ہے!

۹

رتبوں میں یہاں راحت و آرام نہیں
معزول کہیں گردشِ ایام نہیں
کس اوج پہ اڑتے ہیں یہ بادل محروم
رونے کے سوا انکو کوئی کام نہیں!

۱۰

کیوں دارِ فنا کو جائے راحت سمجھے
اور ملکِ بقا کو دارِ آفت سمجھے
محروم سمجھ ہے کچھ تمہاری الٹی
غربت کو وطن وطن کو غربت سمجھے!

۱۱

جمعیتِ دل کا کوئی ساماں کر دے
جو مجمعِ یاس کو پریشاں کر دے
آساں کو کیا ہے بختِ بد نے مشکل
یارب! مری مشکلوں کو آساں کر دے!

۱۲

کس کام کی ہے شگفتگی مصنوعی
رونے کا مقام ہے ہنسی مصنوعی
دل کو حاصل ہو کیا تصنّع سے فراغ
کھلتی دیکھی نہیں کلی مصنوعی!

۱۳

ہر چیز اگرچہ اب ہوئی مصنوعی
تو اپنی بنا نہ زندگی مصنوعی
صنعت کو فروغ کتنا ہوا قدرت پر
اڑ اڑ کے گرے گی یہ پری مصنوعی!

۱۴

ہے صبحِ بہار جلوہ افگن محرم
باغِ جنت ہوا ہے گلشن محرم
یہ جوشِ بہار یہ وفورِ گل ہائے
تو یاں سے چلا ہے خالی دامن محرم!

۱۵

ہے ہے! کیا دلنشیں ادائے گل ہے
زینت بخشِ چمن بقائے گل ہے
کیا حسن ہے کیا لطافت اللہ اللہ!!
اے وائے! کہ مختصر بقائے گل ہے!

۱۶

ایک دوست نے لاہور سے نرگس کے پھول بھیجے۔ رستے میں کملا گئے

یہ رباعی ان پھولوں کی رسید میں لکھی گئی

ای دوست بچہ گویمت کہ نرگس چوں مرد ۔۔۔ واں تازگیش ہوائے دوراں چوں برد
لا ریب رسید تا بہ اینجا شاداب ۔۔۔ چشمے بر حالِ من کشود و افسرد

۱۷

الفت کا چمن اُجڑ گیا ہے یا رب ۔۔۔ رنگِ گل پھیکا پڑ گیا ہے یا رب!
گلشن میں چلی ہو لئے نخوت ایسی ۔۔۔ ہر غنچے کا مُنہ بگڑ گیا ہے یا رب!

۱۸

محرومِ بہارِ نوجوانی کب تک ۔۔۔ فانی ہے جہانِ زندگانی کب تک
تنگ آ کے کریگی قافیہ موت اک دن ۔۔۔ یہ طبعِ روان و شعر خوانی کب تک!

۱۹

قطعه

ترجمہ از انگریزی

مرد را پیروان بعہدِ شباب گشت پیرانہ گر خیالِ اُو

زن جوانست اگرچہ پیرہ بود ہست قایم اگر جمالِ اُو

۲۰

قطعه

شاعر استم بغیرِ فکرِ سخن ہیچ فکرِ دگر ندانم کرد

میدہد مختتم زمانہ عبث بُلبُلم کارِ خر ندانم کرد

۲۱

قطعہ

ترجمہ از سنسکرت

اس پرندے کی طرح دنیا میں رہنا چاہیئے
چہچہاتا ہے خوشی سے جو کہ نازک شاخ پر
جھولتی ہے شاخ لیکن خوف کچھ اس کو نہیں
گر نہیں سکتا کہ ہیں موجود اُڑ جانے کو پر!

۲۲

ترجمہ از انگریزی

مصروفِ کارِ نیک رہو تم تمام دن
تا شب کو پاؤ لذّتِ فردوس خواب میں

پیری میں رہنا چاہو اگر نوجوان تم
دامانِ کارِ خیر نہ چھوڑو شباب میں

وہ طرزِ زیست ہو کہ جو مانگو دعا کبھی
ہو غیب سے نہ یاس ہویدا جواب میں

اغلاط نامہ کلامِ محروم

نمبر صفحہ	نمبر سطر	غلط	صحیح
۲	۱۱	اسلا	اصلا
۳	۳	نازمیناں	نازنیناں
۱۵	۵	پڑجاتا ہو	پڑھاتا ہے
۱۸	۴	آئینہ	آئنہ
۳۲	۳	تیری	تری
۳۳	۱۰	چاہیے	چاہئے
۴۷	۳	تیرا	ترا
۶۹	۳	تیرے	ترے
۹۷	۳	بیجان	بیجاں
〃	۶	آئی	لائی
۱۰۴	۱۱	خون	خوں

نمبر صفحہ	نمبر سطر	غلط	صحیح
۱۰۷	۹	کا	کے
۱۲۶	۶	صبائے	صہبائے
۱۳۵	۱۰	ترے	تیرے
"	۱۲	ہے	ہے
۱۶۲	۱۰-۸	پائی - رَوج	مچاتی - اَوج
۱۶۴	۳	چھپ لاکھ	چھپ کے لاکھ
۱۸۰	۳	درد	درِد
۱۸۵	۱۱	ترا	تیرا
۱۸۶	۴	دلبر	دلبرِ
۱۹۶	۸	ہے	سے
۱۹۸	۳	سے	ہے
۲۰۵	۱۱	اُڑاتا	اُڑتا
۲۱۴	۶	خوشی	خوش
۲۷۰	۱	روتی اور	روتی تھی اور
"	۷	تھے آپ	تھے کہ آپ
۲۷۹	۵	دعویٰ	دعوی

نمبر صفحہ	نمبر سطر	غلط	صحیح
۳۱۷	۶	گُل	کل
۳۶۹	۳	تیری	تری
"	۴	تیری	تری
۳۷۴	۸	خاک اڑتی	خاک اڑاتی
۳۷۵	۱	لہلہاتے	لہلہائے
۳۷۶	۵	فلک	اوجِ فلک
۳۷۸	۱۱	تیرے	ترے
۳۸۰	۷	پر اسرار	پُر اسرار
"	۸	بُہر	مُہر
۳۸۱	۸	تیرے	ترے
۳۹۸	۶	کہس	کہیں
۴۰۱	۱۰	بہار گل	بہارِ گُل
۴۰۲	۹	بجھائیں	بجھائیں گے
۴۱۴	۷	اب	لب
۴۱۸	۱۲	کھپلتی	کھیلتی

نمبر صفحہ	نمبر سطر	غلط	صحیح
۴۲۸	۷	جان	جاں
۴۳۸	۱	پرواز	پرواز
۴۴۶	۶	اثرِ	آثرِ
۴۶۹	۱	اُنکی	انکی
〃	۷	نظر	نَظَر
۴۷۶	۴	رقاقت	رفافت
۴۷۸	۴	قطرت	فطرت
۴۸۰	۱۱	اسان	انساں
۴۸۱	۵	خرد	خرد
۵۱۷	۵	ثازش	نازش
۲۵۶	۱	مرغانِ ہوا ماتم	مرغانِ ہوا! ماتم